تصوّراتِ قرآن

از

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ کا ملخص

مرتبہ

ڈاکٹر سید عبداللطیف

تعداد ۵۰۰

قیمت ۵/۵۰

ناشر .... پرویز بک ڈپو۔ دہلی ۶

ملنے کا پتہ

ناز پبلشنگ ہاؤس پہاڑی بھوجلہ

دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

تقریباً انیسویں صدی کے وسط سے علمائے اسلام نے قرآن کو دنیائے جدید کے آگے نئے انداز سے پیش کرنے کی متعدد کوششیں کی ہیں۔ اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا بیشتر حصہ چاہے وہ تفاسیر یا تنقیدی تحقیق کی شکل میں ہو یا مختلف رسائل یا جرائد میں شائع ہونے والے مضامین کی شکل میں۔ اردو عربی اور انگریزی میں پایا جاتا ہے۔ اظہار خیال کے لئے خواہ کوئی زبان استعمال کی گئی ہو۔ بہرصورت ان کوششوں کا ماحصل اطمینان بخش نہیں ہے۔ عصر جدید کے ان علماء نے زیادہ تر اس بات کی سعی فرمائی ہے کہ قرآنی مطالب کو یورپی کلچر کے فکری سانچوں میں ڈھال کر پیش کیا جائے جس طرح سے کہ قرون اولیٰ کے بعض مفسرین نے یونانی علوم کے عربی ترجموں سے متاثر ہو کر قرآنی مطالب کو یونانی فلسفہ و فکر کا لباس پہنانے کی کوشش کی تھی۔ البتہ شاذ و نادر ہی ایسی مثالیں ملتی ہیں اور صرف کہیں کہیں کچھ ایسے گوشے ابھرتے ہیں جہاں قرآنی تعلیمات اپنی

حقیقی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ غرض کہ ان جدید علماء اور مفسرین نے قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کرنے کی کوئی مستقل کوشش نہیں کی۔
دورِ جدید کے علماء کی مساعی سے متاثر ہو کر حال حال میں قدامت پسند علمانے بھی تفہیمِ قرآن کے تعلق سے بلاشبہ خود کو جدید طرزِ فکر کے حامل ظاہر کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ لیکن صدیوں سے مسلمانوں کی مذہبی فکر پر قرونِ وسطیٰ کی قدامت پسندی کا جو بھاری بوجھ مسلط تھا۔ اس سے وہ چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ البتہ ۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ امید کی ایک کرن دکھائی دی جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی "ترجمان القرآن" کی پہلی جلد منظرِ عام پر آئی جس کا پہلا حصہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے اور جس میں قرآنی عبارت کو اس کے اصلی معنی میں پیش کرنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا طریقِ اظہار ہے جو نہایت سیدھا سادا ہے۔ نہ تو اس میں کوئی پیچیدگی پائی جاتی ہے اور نہ کسی قسم کا تصنع۔ وہ انسان کے فطری احساس و فکر اور زندگی کے روزمرہ کے تجربوں کو اپیل کرتا ہے گویا خدا اور بندہ کے درمیان راست بات چیت ہے جو ایسی زبان میں ہے جسے ایک عام آدمی بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ قرآن میں وہی اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے جو تمام الٰہی صحائف کا ہے لیکن قرآن کا یہ طریقِ اظہار اپنی اہمیت کے باوجود عہدِ ماضی میں شاذ و نادر ہی کسی دارالعلوم یا اسلامی درسگاہ میں مطالعہ و فکر کا کوئی

مستقل موضوع بن سکا حالانکہ خود قرآن نے ان الفاظ میں رہنمائی فرمائی ہے:۔

فذکّرو بالقرآن: ۵۰-۴۵ — قرآن کو قرآنی انداز میں سمجھاؤ۔

لیکن تاریخ کے کسی دور میں بجز صدر اول کے اس رہنمائی کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ قرآن کے ساتھ حادثہ یہ پیش آیا کہ جوں ہی اس پر ایمان لانے والوں کی پہلی نسل ختم ہوئی بلکہ دوسری صدی ہجری کے اختتام سے قبل ہی یونانی فلسفہ و علوم کے ترجموں کی بدولت مسلم فکر پر یونانی فکر کا اثر غالب آنے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فہم قرآن کے ابتدائی انداز کی سادگی مفقود ہوگئی اور اس کی جگہ منطقی دقیقہ سنجیاں راہ پانے لگیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ علمائے اسلام نے قرآن کی ایسی تفاسیر لکھنا شروع کر دیں جن میں قرآن کے الفاظ کو ایسے معنی و مفہوم پہنانے لگے جن کے وہ حامل نہیں تھے۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کے پہلے ایڈیشن کے دیباچہ میں ان امور کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یاد رہے کہ قرآن کسی مرتبہ منصوبہ کی پیداوار نہیں تھا بلکہ پیغمبر اسلام کی تبلیغی ضرورتوں اور بدلتے ہوئے حالات کے تحت ۲۳ برس کے دوران میں بتدریج نازل ہوا تھا جن لوگوں نے سب سے پہلے اس کے پیام کو قبول کیا اور اس کے بتائے ہوئے راستوں پر کامیابی کے ساتھ گامزن رہے انہی کے سمجھائے ہوئے مطالب قرآن کو فہم قرآنی کا معیار قرار دیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن بعد کے مفسرین قرآن نے ان کی تشریحات و تعبیرات کو

پس پشت ڈال دیا اور قرآن میں نئے نئے معنے پیدا کرنے لگے پھر جیسے جیسے دوسری اقوام کے لوگ اپنے سابقہ عقائد کی یاد کو اپنے ذہنوں میں لئے ہوئے حلقہ اسلام میں داخل ہوتے گئے اس رجحان میں اضافہ ہی ہوتا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآنی تعلیمات کے تعلق سے سو طرح کے حیرت انگیز اور الجھنیں پیدا کرنے والے نقاط نظر فروغ پانے لگے۔ سیدھے سادھے الفاظ کا سیدھا سادھا مفہوم ، رفتہ رفتہ معقود ہونے لگا اور قرآن کا استعاراتی یا تمثیلی عنصر یا تو صرف لفظی مفہوم کا حامل بن کر رہ گیا یا پھر اسے ایسے معنی پہنا دیئے گئے جو قرآنی تصور کی حقیقی روح سے یکسر مختلف تھے۔ یہ صورتِ حال جیسا کہ راقم الحروف نے کسی اور جگہ لکھا ہے "کچھ تو اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ خدائے واحد اور اس کی صفات کے ساتھ تشبیہ و تجسیم کے غیر قرآنی تصورات وابستہ کر دیئے گئے تھے اور کچھ اس کا باعث وہ متصوفانہ رجحان تھا۔ جو نئی افلاطونیت کی وجہ سے قرآنی تصوف میں داخل ہو گیا تھا اور بڑی حد تک ایک عجمی یا غیر عربی رجحان تھا جس کی سمت یہ تھی کہ قرآن کے عام فہم عبارت کے بین السطور معنی تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔"[1]

اس پر آفت یہ ہوئی کہ بیرونی اثرات کے تحت علوم اسلامیہ کی تاریخ کا جو مجتہدانہ دور ابھرا تھا۔ چوتھی صدی ہجری کے بعد وہ بھی ختم ہو گیا اور ہوا کا رخ دوسری طرف ہو گیا۔ اب ردِ عمل کا دور شروع ہوا اور زندگی اور فکر کے ہر شعبہ میں ہر چیز کے حدود مقرر کر دیئے گئے۔ اس موقع پر ان تمام تبدیلیوں اور ان کی بدولت پیدا ہونے والی طاقتوں کی تاریخ کی تفصیلات بیان کرنا

---

[1] "وہ ذہن جس کی تعمیر قرآن کرتا ہے" مطبوعہ اکاڈمی آف اسلامک اسٹڈیز آغا پورہ حیدرآباد ۱۹۵۲ء

بے محل ہوگا۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ اس وقت سے جو دور شروع ہوا تھا اس میں اس بات کی بھی اجازت نہیں رہی تھی کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے کوئی نیا راستہ نکالا جائے اس دور میں قرآن کی جو تفاسیر لکھی گئیں وہ یا تو سابقہ تفاسیر کا چربہ ہوتی تھیں یا ان کی نقل۔ جیسا کہ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس زمانے کی تفاسیر میں بسا اوقات قدیم تفاسیر کے کمزور بے سروپا اور بے محل پہلوؤں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس دور میں قرآن کی سادگی اور اس کے راست انداز تخاطب کی طرف شاذونادر ہی توجہ کی گئی اور یہ سمجھا جانے لگا کہ دین کے لئے ضروری ہے کہ وہ پراسرار ہو۔ یہ تھا وہ تصور جس نے قبول عام کی سند حاصل کرلی اور قدامت پسند آج تک اسی تصور سے چمٹے ہوئے ہیں۔ رازی اور بیضاوی کی تفاسیر نے جو نمونے قائم کئے تھے آج تک ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے مولانا آزاد نے اپنی تصانیف خصوصاً سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں جسے بلاشبہ مطالعہ قرآن کی کلید کہا جاسکتا ہے ماضی کے اس بے ہنگم ورثہ پر ضرب لگائی ہے۔

ہرچند کہ مولانا آزاد کی زندگی کا بہترین حصہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے اگلے محاذ پر صرف ہوا جس میں قید و اسیری کے کئی مرحلے بھی آئے اس کے باوجود یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ انہوں نے ابتلا و آزمائش کی اس یورش میں بھی اپنی طبعی ذہانت و فطانت کے جوہر کا مظاہرہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور ایسی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں جن کی بدولت علوم اسلامیہ کے شعبہ میں انہیں ایک مسلمہ مرتبہ و وقار حاصل ہوگیا۔ قرآنی تعلیمات کے بارے ان کی تحقیق و کاوش نے ان پر اس حقیقی انسانیت دوستی کو منکشف کردیا تھا

جو قرآن کی اساس اصلی ہے۔ قرآن کی فیض یافتہ اس انسانیت دوستی کو انہوں نے اپنے اندر کچھ اس طرح جذب کر لیا تھا کہ قرآنی تعلیمات اور اس کی تمام جزئیات کا مطالعہ وہ اسی کی روشنی میں کرتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم ان کے قرآنی مطالعے کے علاوہ ان کے دوسرے مذاکرات و خطبات پر نظر ڈالتے ہیں جو انہوں نے مختلف علمی مجالس میں ارشاد فرمائے تو ہم یہ پاتے ہیں کہ ان متعدد سیاسی اور ثقافتی مسائل کے بارے میں بھی جن سے آج کی دنیا دوچار ہے وہ اسی انسانیت دوستی میں ان کا حل تلاش کرتے ہیں

مولانا آزاد کے مطالعۂ قرآنی نے متعدد پیرایۂ اظہار اختیار کئے جن میں سب سے زیادہ اہم ان کا یادگار کارنامہ ان کی تصنیف "ترجمان القرآن" ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے اور جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ترجمان القرآن اردو میں قرآن کا توضیحی ترجمہ ہے جس میں متعدد حواشی اور فٹ نوٹ بھی شامل ہیں۔ اس تصنیف کی حقیقی غایت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے آگے قرآنی زبان و الفاظ کے وہی معنی اور مفہوم پیش کئے جائیں جو نزول قرآن کے وقت سمجھائے گئے تھے۔ قرآن کے اسلوب و انداز کو آسانی کے ساتھ ذہن نشین کرنے کے لئے انہوں نے ترجمان القرآن کے پہلے حصے یعنی سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے ضمن میں ان بنیادی تصورات سے بحث کی ہے جن کو قرآن پیش کرتا ہے اور کسی نہ کسی نہج سے جن کا ذکر پورے قرآن میں بار بار آتا ہے۔

ان کے ان مذاکرات میں جو بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اس امتیاز کو واضح کیا ہے جو قرآنی تصورات اور ان کے

عمل لانے کے طریقۂ کار کے درمیان پایا جاتا ہے۔ پہلی چیز کو وہ دین کہتے ہیں اور دوسری چیز کو شرع یا منہاج سے تعبیر کرتے ہیں۔ خود قرآن میں یہی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ اول الذکر یعنی دین جیسا کہ خود قرآن کا ارشاد ہے خدا کے منتخب بندوں کے ذریعہ جو پیغمبر کہلاتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی ہر جماعت اور ہر گروہ کو دیا گیا تھا۔ اور اسی بنا پر مولانا آزاد یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہر وہ مذہب جو آج دنیا میں پایا جاتا ہے اولاً اس کی بنیاد وہی دین تھا جس کا ذکر قرآن کرتا ہے گو امتداد زمانہ کی بدولت اس کی شکل بگاڑ دی گئی ہو ۔ وہ دین جو مختلف پیغمبروں کے ذریعہ بنی نوع انسان کو عطا کیا گیا۔ لیکن مولانا آزاد سمجھتے ہیں کہ جہاں تک شرع یا منہاج کا تعلق ہے مختلف زمانوں کے حالات زندگی اور وقت کی ضرورتوں کے لحاظ سے بنی نوع انسان کے مختلف گروہوں میں الگ الگ نوعیت کی حامل رہی لہذا قرآن کا ارشاد ہے کہ جب تک دین کے بنیادی تصور سے کسی شرع و منہاج کا تصادم نہ ہو۔ اس تنوع سے الجھنے کی ضرورت نہیں جو چیز بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ دین ہے یعنی خدائے واحد کی ذات پر مضبوط ایمان جس کا اظہار عمل صالح کے ذریعہ اس طرح ہو کہ اسی کی بدولت وحدتِ انسانی قائم ہو سکے۔

مولانا آزاد بڑے افسوس کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ تصور جس کی غایت بنی نوع انسان کو ایک خاندان کے رشتے میں منسلک رکھنا تھا انسانی تاریخ کے دور میں خود غرض عناصر نے اسے کچھ اس طرح مسخ کر دیا کہ انسان انسان

کے درمیان طرح طرح کے اختلافات و نزاعات رونما ہو گئے اور اسی کو دین سمجھ لیا گیا۔

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کا پورا ایک حصہ تصور الٰہی کے موضوع کے لئے مختص کر دیا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح بہ شمول مذہب اسلام ہر مذہب کے پیروؤں نے وحدت الٰہی کے بنیادی تصور کو بگاڑ دیا ہے مولانا آزاد کے افسوس و تاسف کا یہی وہ پہلا تاثر ہے جو ان کے استدلال کا محور ہے اور وہ تمام انسانوں سے یہ دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ اصل دین (الدین) کی طرف لوٹ آئیں کیونکہ بنی نوع انسان کے مختلف گروہوں کے درمیان امن و سلامتی اور ہم آہنگی کا یہی ایک [illegible] ہے۔

یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ مولانا آزاد کے مطالعۂ اسلام کے نتائج کا پورا سلسلہ اب تک اس تعلیم یافتہ طبقہ کی دسترس سے باہر ہے جو اردو زبان سے واقف نہیں ہے۔ اگر شروع ہی سے اس بات کی بھی ساتھ ہی ساتھ کوشش کی جاتی۔ اسی وقت سے جبکہ پہلی مرتبہ ان کا اخبار "الہلال" طلوع ہوا تھا۔ کہ ان کی قرآنی تحقیقات کے نتائج کو کم از کم انگریزی زبان میں منتقل کیا جاتا جسے اکثر و بیشتر ممالک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جانتے ہیں تو میں یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ ایسے اقدام کی بدولت ہر جگہ کے ارباب فکر و نظر کے لئے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تمام مذاہب کے مشترک عنصر کو منظر عام پر لانے اور مذہبی رواداری اور عالمی اتحاد پیدا کرنے کی راہ میں ایک طاقتور محرک بن جاتا۔

اب بھی اس سمت میں پہلا قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد کی تمام تصانیف اور تحریروں میں ترجمان القرآن ان کا سب سے بڑا اور منفرد کارنامہ ہے اور اس کا ابتدائی باب جو سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے طور پر لکھا گیا ہے قرآنی مطالعہ کے لئے ایک شاہکار تعارف ہے۔ مولانا آزاد نے اس افتتاحی باب کو اتنی زبردست اہمیت دی ہے کہ اس تصور کی تشریح میں۔ جسے سورۂ فاتحہ میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ پورے قرآن کا جائزہ لیتے ہیں۔ قرآن کا باقاعدہ مطالعہ کرنے والے اس حصہ میں علم و فکر کا ایک ایسا بے پناہ ذخیرہ پائیں گے جو متداول تفاسیر میں کہیں اور نہیں ملے گا۔

راقم الحروف نے ایسے لوگوں کے استفادہ کی خاطر مولانا آزاد کی ایما پر سورۂ فاتحہ کی پوری تفسیر کو انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ جسے علیحدہ کتابی شکل میں پیش کیا جائے گا لیکن ان لوگوں کے لئے جو مذہب کے اس بنیادی تصور کا سرسری طور پر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اس کا ایک تشریحی خلاصہ ان صفحات پر پیش کیا جا رہا ہے جسے اس تصور کے اہم خدوخال کے لحاظ سے مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے

راقم الحروف نے اس موضوع کو اسی انداز سے انگریزی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو مولانا آزاد کا خاص انداز ہے تاکہ انہی کے انداز بیان میں ان کے نقطۂ نظر کا لب لباب پڑھنے والوں کے سامنے آجائے جب ترجمان القرآن کی تیسری جلد شائع ہو جائے گی اس وقت ارباب علم و فضل کے لئے یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ ہندوستان کے اس عظیم المرتبت

علامہ کی زبردست ذہانت و فطانت کا پوری طرح اندازہ لگا سکیں اور ان خدمات کا اعتراف کر سکیں جو انہوں نے صرف اسلامی علوم ہی کی نہیں بلکہ عالم فکر و نظر کے لئے بھی انجام دی ہیں۔ بالفعل راقم الحروف کی یہ ناچیز کوشش ایک ابتدائی تعارف کا مقصد پورا کر سکتی ہے۔[1]

ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں ایم اے ڈاکٹر فلاسفی ریڈر، کیوریٹر اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد کا شکرگزار ہوں کہ موصوف نے ازراہ کرم اس کتاب (یعنی اصل انگریزی کتاب) کا اشاریہ مرتب کیا اور طباعت کے دوران اس کے پروف دیکھے۔

سید عبد اللطیف

---

[1] یہ بات قابل اظہار ہے کہ مولانا آزاد نے اس دیباچہ اور اس کتاب کے متن کو ملاحظہ فرمایا اور ملاحظہ کے بعد جس طرح انہوں نے واپس فرمایا من و عن اسی طرح اس کی طباعت عمل میں آئی ہے۔

سید عبد اللطیف۔

پہلا باب

قرآن کا تصورِ الٰہ

کسی مذہب کے مطالعہ میں سب سے پہلی توجہ طلب بات یہ ہوتی ہے کہ اس کے تصورِ الٰہی کی نوعیت کیا ہے کیونکہ بالآخر مذہب کا یہی پہلو زندگی کو اپنی قدر و قیمت کا معیار عطا کرتا ہے۔

تصورِ الٰہی کی تاریخ ایک بوقلموں تاریخ رہی ہے مادہ کی مماثلت میں کسی شخص کو تصورِ الٰہی کی تشکیل میں بھی تدریجی ارتقاء کا دھوکا ہو سکتا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ خدا کی ہستی کا اعتقاد کسی وقت بھی انسانی ذہن کا کارنامہ نہیں رہا کہ نیچے سے اوپر کی طرف اس کی نشوونما کا کھوج لگایا جائے بلکہ یہ اعتقاد فطرتِ انسانی کی خلقت میں شامل ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ انسان نے سب سے پہلے خدا کی جو خیالی تصویر بنائی وہ اس کی یکتائی یا توحید کی تصویر تھی۔ ایک ایسی ان دیکھی اور برتر ہستی کی تصویر جس نے ان سب چیزوں کو پیدا کیا جنہیں انسان اپنے چاروں طرف دیکھتا یا محسوس کرسکتا تھا۔ اور پھر آہستہ آہستہ یہ تصویر بدلتی گئی اور اس میں ایک طرح کا انحطاط پیدا ہوتا گیا یہاں تک کہ توحیدِ الٰہی کی جگہ اشتراک اور تعدد الٰہ

کا تصور ابھرنے لگا یعنی دوسرے الفاظ میں انسان کی دینیاتی تاریخ میں ارتقاء کے بجائے ارتجاع کا عمل کارفرما نظر آتا ہے۔ البتہ جہاں تک صفات الہٰی کا تعلق ہے ارتقاء کے نظریہ سے تحقیق و جستجو کے میدان میں گراں قدر مدد مل سکتی ہے۔

علمائے یورپ کا یہ رجحان کہ عقیدۂ توحید کو تدریجی ارتقاء کا نتیجہ قرار دیا جائے اٹھارھویں صدی کے اواخر میں نمایاں ہوا لیکن اس خیال پر مبنی بیشتر نظریے انیسویں صدی کے نصف آخر میں مدون ہوئے اور نوامیس فطرت و بے جان اشیاء کی پرستش، اجداد پرستی خرافاتی اساطیر، اجرام سماوی کی پوجا اور جادو ٹونے وغیرہ کے عقیدہ میں خدا پرستی کی ابتدا کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان مختلف نظریات نے جس خیال کو پروان چڑھایا وہ یہ تھا کہ زندگی کے دوسرے مظاہر کی طرح توحید الہٰی کا تصور بھی ایک تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔

لیکن بیسویں صدی کے انقلاب انگیز انکشافات نے اس خیال کو متزلزل کر کے رکھ دیا۔ جنوب مشرقی آسٹریلیا اور بحیرہ کاہل کے جزائر میں بسنے والے وحشی قبائل اور پھر شمالی امریکہ کے ان قدیم قبائل کے بارے میں جو عہد عتیق سے آج تک زندگی کے ایسے قدیم ترین طریقوں پر کاربند ہیں جن کے تہذیبی دامن میں ارتقائی ترقی کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ جب تحقیق تمام ہوا اور پھر مصریات کی تحقیقات اور عراق اور مہنجو داڑو کی کھدائیوں کے آثار سامنے آئے تو یہ حقیقت برملا ہو گئی کہ انسان کا توحیدی

اعتقاد کسی ارتقائی سلسلہ کی کڑی نہیں ہے چنانچہ جدید سامی اثریات کے مطالعہ سے بھی اس نقطۂ نظر کی تصدیق ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ تمام سامی قبائل اپنے ابتدائی دور میں ایک ان دیکھے خدا پر اعتقاد رکھتے تھے. پہلی جنگ عالمگیر کے بعد سرحد حجاز کی وادی عقبہ اور شمالی شام کے راس شمرہ میں جو آثار دریافت ہوئے ان سے اس تاریخی حقیقت کو اور زیادہ استحکام حاصل ہو جاتا ہے. مختصر یہ کہ بیسویں صدی کی علمی تحقیق و تلاش نے اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ سب سے پہلے انسان کے دل میں جو عقیدہ پیدا ہوا وہ توحید الٰہی کا عقیدہ تھا.

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان نے پہلی مرتبہ اس دنیا میں اپنی آنکھ کھولی تو وہ اپنی فطرت اور اس ماحول کے تحت جس میں اس نے اپنے آپ کو گھرا ہوا پایا وہ ایک ہستی کے اعتقاد پر مجبور ہو گیا جو ان تمام چیزوں کی پیدا کرنے والی تھی جنہیں وہ اپنے اردگرد دیکھ رہا تھا پھر آگے چل کر آہستہ آہستہ اس نے ان تمام صفات اور خصوصیات کو بھی اس ہستی مطلق کی ذات سے وابستہ کرنا شروع کر دیا جو خود اس کی اپنی صفات و خصوصیات سے مماثلت رکھتی تھیں اور اس طرح اس کے ابتدائی عقیدہ توحید میں ایک ترجیعی شکل پیدا ہونے لگی. مولانا آزاد کے الفاظ میں "آدم نے آنکھیں روشنی میں کھولی تھیں پھر آہستہ آہستہ تاریکی پھیلنے لگی". چنانچہ مصر، یونان، کالڈیا ہندوستان، چین اور ایران ان سب ملکوں کی روایتوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں نوع انسانی فطری ہدایت کی زندگی بسر کرتی تھی

انجیل نے قطعی انداز میں آدم کے وجود کو ایک بہشتی وجود قرار دیا ہے۔ پھر جب اس کے قدموں میں لغزش آئی تب ہی وہ اس بہشتی زندگی سے بھی محروم کر دیا گیا۔ روشنی کا جلوہ پہلے نمودار ہوتا ہے تاریکی بعد میں آتی ہے۔ قرآن کا اعلان بھی یہی ہے :-

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۰ : ۱۹)

ابتدا میں تمام انسان ایک ہی گروہ تھے (یعنی الگ الگ راہوں میں بھٹکے ہوئے نہ تھے) پھر اختلاف میں پڑ گئے۔

وَكَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (۲ : ۲۱۳)

ابتدا میں تمام انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا (یعنی فطری ہدایت کی ایک ہی راہ پر تھے پھر اس کے بعد اختلافات پیدا ہو گئے) پس اللہ نے ایک کے بعد ایک نبی مبعوث کئے وہ نیک عملی کے نتیجوں کی خوشخبری دیتے تھے بدعملی کے نتیجوں سے متنبہ کرتے تھے۔ نیز ان کے ساتھ نوشتے نازل کئے تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے ہیں ان کا فیصلہ کر دیں۔

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ جہاں تک مذاہب کے اختلافی راہوں کا تعلق ہے۔ ان کا تعلق وجود الٰہی سے نہیں ہے بلکہ یہ اختلافات زیادہ تر صفات الٰہی کے بارے میں پائے جاتے ہیں انسانی عقل محسوسات کے دائرہ میں محدود ہے عموماً اس کا تصور اس دائرے سے باہر قدم نہیں نکالتا اسی لئے عقلِ انسانی

ذاتِ مطلق کے تصور کا بہ آسانی احاطہ نہیں کر سکتی. جب کبھی وہ کسی ان دیکھی چیز کے تصور کی سعی کرے گی تو ناگزیر ہے کہ تصور میں وہی صفات آجائیں جن کا ادراک اسے خود اپنی ذات میں ہوتا ہے. اسی لئے صفاتِ الٰہی کی جو تصویر اس کے ذہن میں پیدا ہوتی تھی لازمی طور پر اس میں بھی اس کی ذہنی طفولیت کا رنگ پایا جاتا تھا. پھر وقت کے ساتھ ساتھ جوں جوں اس کا ذہن ترقی کرتا گیا اسی کے مطابق اس کا تصور الٰہی بھی بدلتا گیا. یہاں تک کہ جتنی اعلیٰ صفات اس کی ذات میں پیدا ہوتی گئیں وہ اپنے معبود کی صفات کو بھی ان کے مطابق بلند کرتا گیا اسی نقطۂ نظر سے خدائی صفات کے بارے میں انسانی تصورات کی ارتقائی رفتار کا پتہ لگایا جا سکتا ہے. مولانا آزاد نے اس ارتقائی سلسلہ کی تین نمایاں کڑیوں کا ذکر کیا ہے جو ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں. یعنی تجسم و تشبیہہ سے تنزیہ کی طرف. پھر تعدد و اشتراک سے توحید کی طرف اور صفاتِ قہر و جلال سے صفاتِ رحمت و جمال کی طرف.

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے متعلق انسان کا ابتدائی تصور صفاتِ قہریہ کے تصور سے کیوں شروع ہوا؟ اس کی علت واضح ہے فطرتِ کائنات کا تعمیری حسن تخریب کی نقاب میں پوشیدہ ہے. انسانی فکر اپنے عہدِ طفولیت میں تعمیر کا پوشیدہ حسن نہ دیکھ سکی وہ تخریب کی ہولناکیوں سے سہم گئی. تعمیر کا حسن و جمال دیکھنے کے لئے فہم و بصیرت کی نگاہ مطلوب تھی جو وقت کی رفتار کے ساتھ تدریجی طور پر انسان کو حاصل ہوئی یہی وجہ تھی کہ سب سے پہلے جب عقل انسانی نے صفات الٰہی کی صورت آرائی کرنی چاہی تو فطرت

کائنات کے طبعی مظاہر کی دہشت سے وہ فوراً متاثر ہو گئی اور ایجابی اور تعمیری حقیقت سے اثر پذیری میں اسے بہت دیر لگی۔ بادلوں کی گرج بجلی کی کڑک، آتش فشاں پہاڑوں کا انفجار، زمین کا زلزلہ، آسمان کی ژالہ باری، دریا کا سیلاب، سمندر کا تلاطم، ان تمام طبعی مظاہر نے اس میں دہشت و ہیبت پیدا کی اور وہ اپنے خدا کو ایک غضبناک خدا کی ڈراؤنی صورت میں دیکھنے لگا۔ بادل اور بجلی کی خوفناک گرج اور کڑک میں یا آتش فشاں پہاڑوں کے بہتے ہوئے لاوے میں وہ حسن و محبوبی کے خدا کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

خود اس کی ابتدائی معیشت کی نوعیت بھی ایسی نہ تھی جو اس کے خوف و دہشت کے جذبات کو کچل سکتی۔ وہ اپنے آپ کو کمزور اور غیر محفوظ محسوس کرتا تھا اور اپنے علاوہ ہر شے اسے دشمنی اور ہلاکت پہ تلی نظر آتی تھی۔ بھیڑیوں کے جھنڈ چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔ زہریلے جانور ہر طرف رینگ رہے تھے اور درندوں کے حملوں سے اسے ہر وقت مقابلہ رہنا پڑھتا تھا۔ سر پہ سورج کی تپش بے پناہ تھی اور سال بھر کے بدلتے ہوئے موسم اسے اپنی عافیت کے دشمن نظر آتے تھے اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز اس کی تباہی و بربادی کے درپے ہے اس ماحول کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اس نے اپنے خدا کا جو تصور قائم کیا وہ ایک خوف و دہشت کے خدا کا تصور تھا لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا تدریجی طور پر اس کی ذات میں اور اس کے ماحول میں بھی تبدیلی آتی گئی اور اس کے تصور میں یاس و دہشت کے پہلو بہ پہلو امید و

رحمت کا عنصر شامل ہوتا گیا یہاں تک کہ معبود بننے کے تصور میں صفات رحمت و جمال نے بھی ویسی ہی جگہ پائی جیسی صفات قہر و جلال کے لئے تھی۔ اس نئی بیداری نے قہر و ہلاکت کی قوتوں کے ساتھ لطف و رحمت کی ان قوتوں کا تصور بھی پیدا کر دیا جو رزق، دولت، حسن اور علم کا مظہر تھیں۔ یونان کا علم الاصنام اپنی لطافتِ تخیل کے لحاظ سے بلاشبہ اپنی خاص جگہ رکھتا ہے لیکن اس کی پرستش کے قدیم معبود بھی قہر و غضب کی خوفناک قوتیں تھیں ہندوستان میں آج تک رحمت و بخشش کے دیوتاؤں سے کہیں زیادہ ہلاکت و تباہی کے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی ہے۔

نزول قرآن سے قبل تنزیہہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہن انسانی متحمل ہو سکا تھا۔ یہ تھا کہ کسی تشبیہی سہارے کے بغیر خدا کا تصور کیا جائے لیکن جہاں تک صفات الٰہی کا تعلق ہے وہ جذبات کی مشابہت اور جسم و ہیئت کی تمثیل سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا یہاں تک کہ یہودی تصور بھی جس نے اصنام پرستی کی ہر شکل کو جائز نہیں رکھا تھا اس قسم کے تشبیہ و تمثیل سے بے نیاز نہ رہ سکا۔ اصل یہ ہے کہ قرآن سے پہلے فکر انسانی اس درجہ بلند نہ ہوئی تھی کہ تمثیل و تشبیہہ کا پردہ ہٹا کر صفات الٰہی کا جلوہ دیکھ لیتی[1] حضرت مسیح نے جب چاہا کہ رحمت الٰہی کا عالمگیر تصور پیدا کریں

---

[1] طلوع اسلام کے وقت مختلف مذاہب عالم میں صفات الٰہی کے جو تصورات تھے۔ اس موضوع پر مولانا آزاد نے اپنی تصنیف میں تفصیل کے ساتھ ان پر روشنی ڈالی ہے۔ دیکھئے صفحات ۱۳۵ تا ۱۶۵ ترجمان القرآن جلد اول دوسرا ایڈیشن لاہور ۱۹۴۷ء

تو انہوں نے بھی باپ اور بیٹے کے رشتہ کی تشبیہ سے کام لیا۔ اسی تشبیہ کی بدولت ظاہر پرستوں نے ٹھوکر کھائی اور مسیح علیہ السلام کی دی ہوئی مثالی اور مقصد کو نہ سمجھنے کے باعث ان کے پیروؤں نے خود مسیح کو خدا کا بیٹا بنا دیا بلکہ خدا کا مرتبہ عطا کر دیا۔

قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ خدا کے تصور کی راہ سے وہ تمثیل و تشبیہ کے تمام پردے اٹھا دیتا ہے اور خدا اور اس کی صفات کا جلوہ اس طرح سامنے آجاتا ہے کہ اس میں تجسم کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲ : ۱۹)	اس کی مثل کوئی شے نہیں (کسی چیز سے بھی تم اسے مشابہ نہیں ٹھہرا سکتے)
لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۶ : ۱۳۰)	انسان کی نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں لیکن وہ انسان کی نگاہوں کو دیکھ رہا ہے اللہ کی ذات یگانہ ہے بے نیاز ہے اسے کسی کی احتیاج نہیں
قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۝ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (۱۱۲ : ۱۰۱م)	اللہ کی ذات یگانہ ہے بے نیاز ہے اسے کسی کی احتیاج نہیں نہ تو اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی ہستی اس کے درجے اور برابری کی ہے۔

نزولِ قرآن سے قبل جلوۂ حقیقت کی جھلک دیکھنے کے لئے دو راستے اختیار کئے جاتے تھے ایک ذاتِ مطلق سے صفات کو وابستہ کرنے کا راستہ تھا اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ خدا کو تمام صفات سے پاک و بلند رکھا جائے

پہلا راستہ تشبیہ کی طرف لے گیا جس کی وجہ سے عرفانِ حقیقت میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ دوسرا طریقہ وہ تھا جس کا خاص طور سے اوپانی شدوں نے تتبع کیا یہ - نیتی - نیتی - کا ایک منفی تصور تھا بلاشبہ یہ تصور تنزیہہ یا نفی صفات کا ایک انتہائی جلوہ دکھاتا ہے۔ لیکن عملاً وہ نفی کی طرف لے جاتا ہے ہمیں یقین محکم کی لذت سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسا تصور زیادہ سے زیادہ ایک فلسفیانہ تخیل پیدا کر سکتا ہے لیکن زندہ اور راسخ عقیدہ نہیں بن سکتا۔ چنانچہ نفیِ صفات کے تصور کو اس کی منطقی انتہا یعنی تعطیل سے بچانے کے لئے ذاتِ مطلق "برہماں" کو ذاتِ متشخص "ایشور" میں اتارے بغیر کام نہ چل سکا۔ بہرحال (قرآن سے پہلے) ان دو راہوں میں سے کسی ایک کا انتخاب ناگزیر تھا۔ قرآن نے افراط اور تفریط کے ان دونوں راستوں سے احتراز کیا اور اپنی ایک الگ راہ نکالی۔ قرآن نے جو راستہ اختیار کیا وہ ایک طرف تو تنزیہہ کو درجۂ کمال پر پہنچا دیتا ہے دوسری طرف تعطیل سے بھی تصور کو بچائے جاتا ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات کا اثبات کرتا ہے مگر ساتھ ہی ہر صفت کو تشبیہہ کے اثر سے بھی بچا لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا زندہ ہے۔ قدرت والا ہے، پیدا کرنے والا ہے۔ رحمت والا ہے سب کچھ دیکھنے سننے اور جاننے والا ہے وغیرہ وغیرہ اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ قرآن بلا تامل جگہ جگہ گوناں گوں تمثیلات کا استعمال کرتا ہے لیکن اس بات کو بھی واضح کر دیتا ہے کہ خدا کے مشابہ کوئی چیز نہیں جو تصور میں آ سکے۔ اس کا زندہ رہنا ہمارے زندہ رہنے کی طرح نہیں،

اس کا دیکھنا، سننا اور جاننا ویسا نہیں ہے جس طرح کہ ہم دیکھتے سنتے اور جانتے ہیں. اس کی قدرت و بخشش کی تعبیر کے لیئے ہاتھ کی تشبیہ اور اس کے جلال اور ہر چیز پر محیط ہونے کی تمثیل کے واسطے عرش کا استعارہ ضرور ہے لیکن اس کا مطلب وہ نہیں ہو سکتا جو افعال انسانی کے تعلق سے ان الفاظ سے ہمارے ذہن میں متشکل ہونے لگتا ہے۔

قرآن تصور الہٰی کا یہ پہلو فی الحقیقت اس راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے ایک طرف بامِ حقیقت کی وہ بلندی کہ انسانی ذہن و فکر اس بلندی تک پہنچنے سے عاجز اور دوسری طرف انسانی فطرت کا اضطراب طلب اور ذوقِ دید اتنا شدید کہ جلوۂ حقیقت دیکھے بغیر چین نہیں پڑتا. اگر تنزیہہ کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو تعطیل میں جا گرتے ہیں اور اگر اثباتِ صفات کی صورت آرائیوں میں دور نکل جاتے ہیں تو تشبیہہ اور تجسیم میں کھو جاتے ہیں پس قرآن نے جو راستہ بتایا ہے وہ ایسا راستہ ہے کہ نہ تو اثبات صفات کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے پاتا ہے اور نہ تنزیہہ کی باگ ڈھیلی پڑ جاتی ہے اس لئے قرآن کا تصور الہٰی، آریائی فلسفہ کے تصور الہٰی سے ممتاز ہے. آریائی حکمت نے تلاشِ حقیقت کی سرگرمی میں خود ذات الہٰی کو مشخص کر دیا اور اس طرح مورتی پوجا کے دروازے کھول دیئے. قرآن نے اسے صرف صفات الہٰی کے تشخص سے پورا کر دیا. خدا کے وجود کو مشخص نہیں کیا جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ تشبیہہ و تجسیم کے لئے کوئی امکان باقی نہ رہا۔

خدا کی توحید کا قرآنی تصور ایک محکم تصور ہے، وہ ایجابی اور سلبی دونوں

پہلو رکھتا ہے۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک اور بس ایک ہے اور سلبی پہلو یہ ہے کہ اس کی مانند کوئی نہیں۔ اور جب اس کے مانند کوئی نہیں تو ضروری ہے کہ جو صفات بھی اس کے لئے مختص کی جائیں ان میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا پہلی بات کو توحید فی الذات سے اور دوسری کو توحید فی الصفات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کے اس تصور سے قبل توحید کے ایجابی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا تھا لیکن اس کا سلبی پہلو نمایاں نہ ہو سکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے پہلے کے تمام مذاہب میں اگرچہ عقیدۂ توحید کی تعلیم موجود تھی لیکن کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی اور اصنام پرستی نمودار ہوتی رہی۔

ہندوستان میں تو غالباً روزِ اول سے ہی یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ عوام کی تشفی کے لئے دیوتاؤں اور انسانی عظمتوں کی پرستاری ناگزیر ہے اور خدائے واحد کی پرستش صرف خواص کا حصہ قرار دی گئی تھی، فلاسفہ یونان کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ یقیناً اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ کوہِ المپس کے دیوتاؤں کی کوئی اصلیت نہیں تاہم سقراط کے علاوہ کسی نے بھی اس کی ضرورت نہیں محسوس کی کہ عوام کے اصنامی عقائد میں خلل انداز ہو۔ انہیں اندیشہ یہ تھا کہ اگر دیوتاؤں کی پرستش کا نظام قائم نہ رہا تو عوام کی سماجی و مذہبی زندگی درہم و برہم ہو جائیگی

اس سلسلہ میں کسی یا فی مذہب کو جو مرتبہ عطا کیا جاتا تھا وہ بطور خاص قابل غور ہے۔ یہ درست ہے کہ کوئی تعلیم عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ معلم کی شخصیت میں بھی عظمت کی شان پیدا نہ ہو جائے لیکن شخصیت کی عظمت کے حدود کیا ہیں؟ اسی مقام پر پہنچ کر بہتوں نے ٹھوکر کھائی ہے کیونکہ وہ اس کی

ٹھیک ٹھیک حد بندی نہ کر سکے. نتیجہ یہ نکلا کہ کسی مذہب یا فلسفہ کے معلم کی شخصیت کو کبھی خدا کا اوتار بنا دیا گیا تو کبھی ابن اللہ سمجھ لیا گیا اور یہ نہ ہوا تو اس کی تعظیم و بندگی کی سی شان پیدا کر دی گئی. مثلاً یہودیوں نے بلا شبہ ایسا نہیں کیا کہ پتھر کے بتوں کی پوجا کی ہو تاہم انہوں نے بھی اپنے نبیوں کی قبروں پر ہیکل تعمیر کر کے انہیں عبادت گاہوں کی سی شان و تقدیس دے دی. گوتم بدھ کی نسبت معلوم ہے کہ اس کی تعلیم میں اصنام پرستی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی، اس کی آخری نصیحت جو ہم تک پہنچی ہے یہ ہے کہ "ایسا نہ کرنا کہ میری نعش کی راکھ کو پوجنا شروع کر دو. اگر تم نے ایسا کیا تو یقین جانو نجات کی راہ تم پر بند ہو جائے گی" لیکن ان کے پیرؤوں نے اس وصیت پر جیسا کچھ عمل کیا ہمارے سامنے ہے. نہ صرف یہ کہ بدھ کی خاک اور یادگاروں پر انہوں نے معبد تعمیر کئے بلکہ بدھ مت کی اشاعت کا ذریعہ ہی یہ سمجھا گیا کہ بدھا کے مجسموں سے زمین کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں کسی ذات یا معبود کے آج اتنے مجسمے نہیں ہیں جتنے کہ گوتم بدھ کے ہیں. اسی طرح ہمیں معلوم ہے کہ مسیحیت کی اصلی تعلیم سرتاسر توحید کی تعلیم تھی لیکن ابھی اس کے ظہور پر پورے سو برس بھی نہیں گذرے تھے کہ الوہیت مسیح کا عقیدہ نشو و نما پا چکا تھا اس کے برعکس قرآن نے توحید فی الصفات اور توحید فی الذات کا ایک ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ شرک اور اس کے مماثل دوسری لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے اور خدا کے تصور کے بارے میں یہی اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر طرح کی عبادت و نیاز کی مستحق

صرف خدا کی ذات ہے پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے آگے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ قرآن کہتا ہے۔
یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی ہے اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی اس کا شریک بنایا تو گویا اسے تم نے خدا کی خدائی میں شریک ٹھیرا لیا اور تمہارا عقیدۂ توحید درہم برہم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تلقین کی گئی ہے اور پورا زور اِیَّاکَ پر ہے تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور رد اشراک پر زور دیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورۃ بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔

اور یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب ہم قرآن میں پیغمبر اسلام کو جو مرتبہ دیا گیا ہے اس پر نظر ڈالتے ہیں۔ قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام ایک بشر اور خدا کے بندے ہیں۔ اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ ہی یہ قرار دیا ہے کہ :-

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد (صلعم) خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہے

اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی اور رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہیئے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ صرف اس لئے کہ اس بات کا کوئی موقع ہی نہ رہے کہ عبدیت

کی جگہ معبودیت کا اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیل پیدا ہو، کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی کا بھی اقرار نہ کرے۔

یہی وجہ تھی کہ پیغمبر (صلعم) کی وفات کے بعد اگرچہ مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے لیکن پیغمبر (صلعم) کی شخصیت کے بارے میں کبھی کوئی نزاعی سوال پیدا نہیں ہوا۔ ابھی آپ کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہیں گذرے تھے کہ پیغمبرؐ کے خسر اور اسلام کے خلیفہ اول حضرت ابو بکرؓ نے بر سر منبر اعلان کر دیا کہ :-

"جو کوئی تم میں محمد (صلعم) کی پرستش کرتا تھا سو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ محمدؐ نے وفات پائی اور جو کوئی تم میں اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اس کے لئے موت نہیں۔"

قرآن سے پہلے مذہبی عقائد کی تعلیم میں بھی خاص و عام کا امتیاز ملحوظ رکھا جاتا تھا، چنانچہ ہندوستان میں خدا شناسی کے تین درجے قرار دیئے گئے تھے۔ عوام کے لئے دیوتاؤں کی پرستش، خواص کے لئے براہِ راست خدا کی پرستش اور اخص الخواص کے وحدت الوجود کا مشاہدہ، یہی حال فلاسفہ یونان کا تھا وہ خیال کرتے تھے کہ ایک غیر مرئی اور غیر مجسم خدا کا تصور صرف اہل علم و حکمت ہی کر سکتے ہیں۔ عوام کے لئے اسی میں امن ہے کہ دیوتاؤں کی پرستاری میں مشغول رہیں۔ لیکن قرآن نے اس امتیاز کو یک قلم مسترد کر دیا،

اس نے سب کو خدا پرستی کی ایک ہی راہ دکھائی اور سب کے لئے صفاتِ الٰہی کا ایک ہی تصور پیش کیا۔ وہ حکما اور عرفا سے لے کر ایک چرواہے اور دہقان تک سب کو حقیقت کا ایک ہی جلوہ دکھاتا ہے اور سب پر اعتقاد و ایمان کا ایک ہی دروازہ کھولتا ہے۔

اس سلسلہ میں معاملہ کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ ہندوستان میں خواص و عوام کے خدا پرستانہ تصورات کے درمیان جو فرقِ مراتب ملحوظ رکھا گیا ہے وہ معاملہ کو اس رنگ میں بھی نمایاں کرتا ہے کہ یہاں کا مذہبی نقطۂ خیال ابتدا سے فکر و عمل کی رواداری پر مبنی رہا ہے گویا ہر مذہبی عقیدے اور عمل کے لئے گنجائش نکالی گئی اور ہر فکر کو آزادانہ نشوونما کا موقع دیا گیا۔ مذہبی اختلافات جو دوسری قوموں میں باہمی جنگ و جدال کا باعث رہے یہاں آپس کے سمجھوتوں کا ذریعہ بنے تفاہم اور تطابق گویا یہاں کے ذہنی مزاج کی ایک عام خصوصیت تھی ایک ویدانتی جانتا ہے کہ اصل حقیقت اشراک اور بت پرستی کے عقائد سے بالاتر ہے تاہم وہ بت پرستی کا مخالف اور منکر نہیں ہو جاتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کے راستے کی یہ پہلی منزل ہے اور راہ رو چاہے کوئی راستہ اختیار کرے مگر مقصودِ اصلی ہر حال میں سب کا ایک ہی ہے۔

بلاشبہ فکر و عمل کی اس روادارانہ سوچ کا جو ہندوستان کی تاریخ میں برابر ابھرتی رہی ہے، ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے لیکن زندگی عمل اور رد عمل کا مظہر ہوتی ہے اور اگر ہم اس راہ میں حد بندی کے خطوط

قائم نہ کریں تو علم و اخلاق کے تمام احکام درہم برہم ہو جائیں گے اور اخلاقی اقدار کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہ رہے گی۔ رواداری یقیناً ایک خوبی کی بات ہے لیکن ساتھ ہی عقیدہ کی مضبوطی، رائے کی پختگی اور فکر کی استقامت بھی زندگی کے ایسے پہلو ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بس یہاں کوئی نہ کوئی حد فاصل ضرور ہونی چاہیے جو ان تمام خوبیوں کو اپنی اپنی جگہ پر قائم رکھے ورنہ اخلاق کے تمام احکام کو مناسب طور پر روبہ عمل نہیں لایا جا سکتا۔ جوں ہی یہ خطوط کمزور ہو جاتے ہیں اور ہلنے لگتے ہیں اخلاق کی پوری دیوار ہل جاتی ہے مثلاً عفو و درگذر بڑی ہی حسن وخوبی کی بات ہے لیکن یہی عفو و درگذر جب اپنی جائز حدود سے آگے نکل جاتا ہے تو عفو و درگذر نہیں رہتا بلکہ بزدلی اور بے ہمتی قرار پاتا ہے۔ شجاعت انسانی سیرت کا سب سے بڑا وصف ہے لیکن یہی وصف جب اپنی حد سے گذر جائے گا تو ظلم و تشدد بن جائے گا۔

دو حالتیں ہیں اور دونوں کا حکم ایک نہیں ہو سکتا۔ ایک حالت یہ ہے کہ کسی خاص اعتقاد اور عمل کی روشنی ہمارے سامنے آگئی ہے اور ہم اس کے بارے میں ایک خاص نتیجہ تک پہنچ گئے ہیں۔ ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی نسبت ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟ ہم اس پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں یا متزلزل ہو جائیں، دوسری حالت یہ ہے کہ جس طرح ہم کسی خاص نتیجہ تک پہنچتے ہیں اسی طرح دوسرے لوگ بعض خاص نتیجوں تک پہنچ گئے ہیں۔ اب ان کی نسبت ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟ ہماری طرح

انہیں بھی اپنی راہ چلنے کا حق ہے یا نہیں؟ رواداری یہ ہے کہ اپنے حق و اعتقاد و عمل کے ساتھ دوسروں کے حق اعتقاد و عمل کا اعتراف بھی کیجئے اور اگر ان کا راستہ آپ کو سر بجا غلط دکھائی دے رہا ہے تب بھی ان کے اس راستے پر چلنے کے حق سے انکار نہ کیجئے لیکن رواداری کی حدود کو یہاں تک بڑھا دیا جائے کہ وہ آپ کے عقیدوں میں بھی مداخلت کرنے لگے اور آپ کے فیصلوں پر بھی اثر انداز ہونے لگے تو پھر یہ رواداری نہ ہوئی۔

مفاہمت زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ ہماری زندگی بجائے خود سر تا سر مفاہمت ہے لیکن اس کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے تاکہ آپ اپنے عقیدہ محفوظ رکھ سکیں۔ لیکن تا وقتیکہ اس میں تبدیلی کے لئے کوئی اندرونی روشنی آپ کے سامنے نہ آئے آپ مجبور ہیں کہ آپ اس پر جمے رہیں اور اس پر قائم رہنے کا آپ کو حق ہے۔ آپ دوسروں کے عقائد کا احترام ضرور کریں گے لیکن اپنے حق پر بھی آپ مصر رہیں گے اور اپنے عقیدہ کو کمزوری کے حوالے نہ ہونے دیں گے۔ ان دو حالتوں میں فرق و امتیاز کی وجہ سے اعتقاد و عمل کی دنیا میں کتنی ہی مصیبتیں نازل ہوئیں۔ اگر اعتقاد کی مضبوطی آئی تو اتنی دور تک چلی گئی کہ رواداری کے تمام تقاضے بھلا دیئے گئے اور دوسروں کے اعتقاد و عمل میں جبراً مداخلت کی جانے لگی۔ بعض اوقات رواداری کو اتنا آگے بڑھا دیا گیا کہ استقامتِ فکر و رائے کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی۔ پہلی بے اعتدالی کی مثالیں ہمیں مذہبی تنگ نظریوں اور سخت گیریوں کی تاریخ میں ملتی ہیں اور دوسری بے اعتدالی کی مثال ہندوستان کی تاریخ مہیا کر دیتی ہے۔ یہاں فکر و عقیدہ کی کوئی بلندی بھی وہم و جہالت کی گراوٹ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی اور علم و عقل

اور وہم و جہل میں ہمیشہ سمجھوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان سمجھوتوں نے ہندوستانی دل و دماغ کی شکل و صورت بگاڑ دی اور اس کی فکری نزنی کا تمام حسن اصنامی عقیدوں اور وہم پرستیوں کے گرد و غبار میں چھپ گیا۔ ہندوستان کے عصری مورخوں نے اس صورت حال کا اعتراف کیا ہے۔ ہمارے عہد کے ایک لائق ہندو مصنف ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس دور کی فکری حالت پر نظر ڈالتے ہوئے جبکہ آریائی تصورات ہندوستان کے مقامی مذاہب سے مخلوط ہونے لگے تھے تسلیم کیا ہے کہ :-

" ہندو مذہب کی مخلوط نوعیت کی توضیح ہمیں اس صورت حال میں مل جاتی ہے۔ صحرا نورد قبائل کے وحشیانہ توہمات سے لے کر اونچے سے اونچے درجے کے تہہ اس غور و خوض تک ہر درجہ اور ہر دائرۂ فکر کے خیالات یہاں باہمدگر ملتے اور مخلوط ہوتے رہے۔ آریائی مذہب اول روز سے کشادہ دل خود رو اور روادار تھا۔ وہ جب کبھی کسی نئے موثر سے دوچار ہوا تو خود سمٹتا گیا اور جگہیں نکالتا گیا۔ اس کی اس مزاجی حالت میں ہم ایک بچے انکسار طبع اور ہمدردانہ مفاہمت کا شائستہ رجحان محسوس کرتے ہیں۔ ہندو دماغ اس کے لیے تیار نہیں ہوا کہ نچلے درجے کے مذہبوں کو نظرانداز کر دے یا کہ گران کی ہستی مٹا دے۔ اس کے اندر ایک مذہبی خبطوں کا غرور نہیں تھا کہ صرف اسی کا مذہب سچا مذہب ہے۔ اگر انسانوں کے ایک گروہ کو کسی ایک معبود کی پرستش، اس کے طور طریقے پر تسکین قلب مہیا کر دیتی

ہے تو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ یہ بھی ایک سچائی کی ایک راہ ہے
مکمل سچائی پر کوئی بہ یکدفعہ ناعش نہیں ہو جا سکتا۔ وہ صرف
بتدریج اور بہ تفریق ہی حاصل کی جا سکتی ہے اور یہاں ابتدائی
اور عارضی درجوں کو بھی ان کی ایک جگہ دینی پڑتی ہے، ہندو
دماغ نے رواداری اور باہمی مفاہمت کی یہ راہ اختیار کی لیکن
وہ یہ بات بھول گیا کہ بعض حالات ایسے بھی ہوتے جب رواداری
کی جگہ نارواداری ایک فضیلت کا حکم پیدا کر لیتی ہے اور مذہبی
معاملات میں بھی گریشم کے قانون کی طرح کا ایک قانون کام کرتا
رہتا ہے، جب آریائی اور غیر آریائی مذاہب باہم گھر ملے، ایک
شائستہ اور دوسرا ناشائستہ، ایک اچھی قسم کا، دوسرا نکما
تو غیر شائستہ اور نکمے اجزا میں قدرتی طور پر یہ میلان پیدا ہو گیا
کہ شائستہ اور اچھے اجزا کو دبا کر معطل کر دے لہ

قرآن کے تصور الٰہی کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کسی
طرح اعتقادی مفاہمت کو جائز نہیں رکھا۔ وہ خدا کے توحیدی اور تنزیہی
تصور میں سرتاسر بے میل اور بے لچک رہا تاہم وہ کسی عنوان بھی دوسرے
عقائد کے بارے میں، روادارانہ طرز عمل سے نہیں روکتا نہیں البتہ اعتقادی
مفاہمتوں کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔

لہ انڈین فلاسفی - از ڈاکٹر رادھا کرشنن جلد اول صفحہ ۱۱۹ دوسرا ایڈیشن

قرآن نے تصورِ الٰہی کی بنیاد انسان کے عالمگیر وجدانی احساس پر رکھی ہے۔ یہ نہیں کیا ہے کہ اسے نظر و فکر کی کاوشوں کا ایک ایسا معمہ بنا دیا ہو جسے خاص طبقہ کا ذہن ہی حل کر سکے۔ زندگی کے بارے میں انسان کا عالمگیر وجدانی احساس کیا ہے؟ یہ ہے کہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوگئی، پیدا کی گئی ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ ایک صانع ہستی موجود ہو۔ قرآن بھی اس بارے میں جو کچھ تبلاتا ہے وہ اتنا ہی ہے۔ اس سے زیادہ جو کچھ ہے مذہبی عقیدہ کا معاملہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ اس کا بوجھ جماعت کے افکار پر نہیں ڈالتا بلکہ اسے اصحابِ جہد و طلب کے لئے چھوڑ دیتا ہے:-

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹: ۶۹) آخری آیت

اور جو لوگ ہم تک پہنچنے کے لئے کوشش کریں گے تو ہم بھی ضرور ان پر راہ کھول دیں گے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (۵۱: ۲۱)

اور ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں زمین میں کتنی ہی حقیقت کی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے اندر بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں۔

اسی مقام سے وہ فرقِ مراتب بھی نمایاں ہو جاتا ہے جو اسلام نے بالکل ایک مختلف شکل و نوعیت میں عوام و خواص کے درمیان ملحوظ رکھا ہے، ہندو مفکروں نے سماج کے مختلف طبقات میں الگ الگ تصور اور عقیدے تقسیم کئے لیکن اسلام نے تصور اور عقیدے کے اعتبار سے اس قسم کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا، وہ ہر انسانی دل و دماغ کے آگے حقیقت کا ایک ہی عقیدہ پیش کرتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ طلب و جہد کے لحاظ سے سب کے مراتب یکساں نہیں ہو سکتے ہر طالبِ حقیقت ایک ہی قسم کی تشنگی لے کر نہیں آتا۔ عامۃ الناس بحیثیت ایک طبقہ کے اپنا ایک خاص مزاج اور

اپنی خاص احتیاج رکھتے ہیں لیکن خاص افراد بحیثیت فرد کے اپنی طلب واستعداد کا الگ الگ درجہ و مقام رکھتے ہیں اور ان کے لئے عرفان و یقین کی راہیں کھلی چھوڑ دی گئی ہیں۔

صحیح بخاری اور مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث ہے جو نہایت جامع اور مانع الفاظ میں اس فرق مراتب کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ حدیث تین مرتبوں کا ذکر کرتی ہے۔ اسلام، ایمان اور احسان۔ اسلام یہ ہے کہ اسلامی عقیدہ کا اقرار کرنا اور عمل کے چاروں ارکان یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو انجام دینا ایمان یہ ہے کہ اقرار کے مرتبہ سے آگے بڑھنا اور اسلام کے بنیادی عقائد کے حق الیقین کا مرتبہ حاصل کرنا اور احسان یہ ہے کہ :۔

اِنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ	تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے گویا
وَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ	اسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے
يَرَاكَ (صحیحین)	نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے

پہلا مرتبہ اسلامی دائرہ کے عام اعتقاد و عمل کا ہے یعنی جس نے اسلامی عقیدہ کا اقرار کر لیا اور اس کے اعمال کی زندگی اختیار کر لی وہ اس دائرہ میں آگیا لیکن محض دائرۂ اسلام میں داخل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ علم الیقین کے مقامات بھی حاصل ہو گئے۔

پہلا مرتبہ صرف اس کے خارجی اور ابتدائی پہلو کا مظہر ہوتا ہے دوسرا مرتبہ ایمان کا ہے۔ یہ انسان کے دل و دماغ کا یقین و اذعان ہے۔ یہ مرتبہ جس نے حاصل کر لیا وہ خواص کے زمرہ میں داخل ہو گیا لیکن معاملہ

اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ عرفانِ حقیقت اور عین الیقین و ایقان کا ایک اور مرتبہ اس کے بعد آتا ہے جسے احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ مقام محض اعتقاد اور یقین پیدا کر لینے کا نہیں ہے جو ایک جماعت یا گروہ کو بحیثیت جماعت یا گروہ کے حاصل ہو جا سکتا ہے۔ یہ مقام ذاتی تجربہ و کشف سے حاصل ہوتا ہے محض تعلیمی عقائد یا فکری قیاسات سے اس مرتبہ تک رسائی نہیں ہوتی۔ یہ سیکھنے اور بتلانے کا معاملہ نہیں، ذاتی تجربہ مختلف کا معاملہ ہے۔ جو یہاں تک پہنچ گیا وہ اگر کچھ بتلائے گا تو بھی یہی بتلائے گا کہ میری طرح بن جاؤ پھر جو کچھ دکھائی دیتا ہے دیکھ لو ۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست   گفتم کہ چو من شوی بدانی

اسلام نے اس طرح طلب و جہد کی روحانی پیاس کے لئے درجہ بدرجہ سیرابی کا سامان مہیا کر دیا۔ عام آدمی کے لئے پہلا مرتبہ ہے زیادہ ترقی یافتہ انسان کے لئے دوسرا مرتبہ اور خاصان خاص کے لئے تیسرا مرتبہ ہر چند کہ ہر ایک کے لئے جام الگ الگ ہیں لیکن پیاس بجھانے کے واسطے میخانہ ایک ہی ہے۔ ہر ایک کے حصہ میں اس کے ظرف کے مطابق ایک جام آجاتا ہے۔

ساقی بہمہ بادہ زیک خم دہد اما   در مجلس او مستی ہر کس ز شرابے است

یہاں اس امر کی جانب اشارہ کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ علمائے اسلام خصوصاً صوفیائے کرام نے خدا کے بارے میں ایک تصور قائم کیا ہے جو عام طور سے نظریہ وحدت الوجود کہلاتا ہے۔ توحید وجودی کے قائل قرآنِ

کی مختلف آیات سے اس نظریہ پر استدلال لاتے ہیں۔ مثلاً
"هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ " اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ " اور " وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ " اور " كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ " وغیرہ وغیرہ

دہلی کے مشہور محدث شاہ ولی اللہ نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اگر میں مسئلہ وحدت الوجود کو ثابت کرنا چاہوں تو قرآن و حدیث کے تمام نصوص و ظواہر سے اس کا اثبات کر سکتا ہوں۔" لیکن مولانا آزاد متنبہ کرتے ہیں کہ "اس بارے میں صاف بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ ان تمام تصریحات کو ان کے قریبی محامل سے دور نہیں لے جانا چاہیے اور ان معانی سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے جو صدر اول کے مسلمانوں نے سمجھے تھے۔ باقی رہا حقیقت کے کشف و عرفان کا وہ مقام جو عرفاء طریق کو پیش آتا ہے تو وہ کسی طرح قرآن کے تصور الٰہی کے عقیدے کے خلاف نہیں۔ قرآن کا تصور الٰہی ایک جامع تصور ہے اور ہر توحیدی تصور کی اس میں گنجائش ہے۔ جو افراد خاصہ مقام احسان تک رسائی حاصل کرتے ہیں وہ حقیقت کو اس کی پس پردہ جلوہ طرازیوں میں بھی دیکھ لیتے ہیں اور عرفان کا وہ منتہیٰ مرتبہ جو فکر انسانی کے دسترس میں ہے انہیں حاصل ہوتا ہے۔"

باب دوم

صفت ربوبیت

صفاتِ الٰہی کے ذکر میں مولانا آزاد ایک عام جائزہ لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کائنات کے نظام ہستی میں وحدت وجود کا جلوہ وحدت صفات کی شکل میں دکھائی دیتا ہے یعنی صفات الٰہی کا الگ الگ اظہار نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ظاہر ہوتی ہیں تاکہ زندگی میں ہم آہنگی کا جلوہ نظر آئے سورۂ فاتحہ یا قرآن کے افتتاحی باب میں خدا کی چند بنیادی صفات کا ذکر کیا گیا ہے جیسے ربوبیت، رحمت، عدالت اور ہدایت کی صفات۔ مولانا آزاد اپنی تفسیر میں بالترتیب ان صفات پر روشنی ڈالتے ہیں اور پورے قرآن سے ان کی جلوہ نمائی کے ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ خدا کی اولین صفت یعنی ربوبیت کا ذکر کرتے ہیں جو قرآن کی توجہ کا مرکز ہے۔

ربوبیت کی اصطلاح رب سے نکلی ہے جو سامی زبانوں کے کئی الفاظ کا مشترک مادہ ہے۔ عبرانی، عربی اور سریانی تینوں زبانوں میں 'رب' کے معنی پالنے والے کے ہیں یا ایسی ہستی کے جو اسباب پرورش مہیا کرتی ہے چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے اس لیے 'رب' کے لفظ کو جو معنی عطا کئے گئے گویا وہ خدا کے تصور کا پہلا

قدرتی زینہ تھے جس کے بارے میں ابتدائی سامی ذہن نقش آرائی کر سکتا تھا رب کے معنی معلم، آقا یا خدا کے بھی ہیں۔ قرآنی زبان میں اس لفظ کو اس کے وسیع اور کامل معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اسی لئے بعض علمائے لغت نے ربوبیت کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے هُوَ اِنْشَاءُ الشَّيْءِ حَالاً فَحَالاً اِلٰى حَدِّ التَّمَامِ۔ یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ اپنی حد کمال تک پہنچ جائے۔ یعنی ربوبیت کے لئے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود کو اس کی تکمیل و بلوغ کے لئے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں ان سب کا سروسامان ہوتا رہے۔ لیکن قرآنی تصور کے لحاظ سے مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ ربوبیت میں محبت و شفقت کا لگاؤ ضروری ہے۔ ایک تمثیل کے ذریعہ ان معنوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے زندگی اور نمو کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے سب کی سب پرورش و تربیت کی محتاج ہوتی ہیں۔ یہ پرورش محبت و شفقت، حفاظت و نگہداشت اور بخشش و اعانت کا ایک طول طویل سلسلہ ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک بچہ اپنے جسم و ذہن کے حد بلوغ تک نہ پہنچ جائے۔ پھر پرورش کی ضرورتیں ایک دو نہیں بے شمار ہیں۔ ان کی نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور ضروری ہے کہ ہر عمر اور ہر حالت کے مطابق محبت کا جوش، نگرانی کی نگاہ

اور نگرانی کا سروسامان ملتا رہے، حکمت الٰہی نے ماں کی محبت میں ربوبیت کے یہ تمام خدوخال پیدا کر دیئے ہیں، یہ ماں کی ربوبیت ہی ہے جو پیدائش کے دن سے لے کر بلوغ تک بچہ کو پالتی، بچاتی، سنبھالتی اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق اس کی ضروریات پرورش کا سروسامان مہیا کرتی ہے جب بچہ کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہیں ہو سکتا تو اسے دودھ ہی پلایا جاتا ہے جب دودھ سے قوی غذا کی ضرورت ہوتی ہے تو ویسی ہی غذا دی جانے لگتی ہے، جب بچہ میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت نہیں ہوتی تو ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی ہے، جب وہ کھڑے ہونے کے قابل ہو جاتا ہے تو ماں اس کی انگلی پکڑ کر اسے ایک ایک قدم چلاتی ہے۔ بس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیا ہوتی رہیں، اور نگرانی و حفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہے وہ صورت حال ہے جس سے ربوبیت کے مفہوم کا تصور کیا جا سکتا ہے،، قرآن نے رب کی حیثیت سے خدا کا جو تصور پیش کیا ہے اس تمثیل کی روشنی میں آسانی سے اسے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے خدا کے ساتھ رب العالمین کی صفت کو وابستہ کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کسی خاص قوم یا گروہ کا رب پالنے والا نہیں ہے بلکہ بنی نوع انسان اور کائنات ہستی کی تمام مخلوقات کا رب ہے۔

نظام ربوبیت

مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں کہ ربوبیت الٰہی کا عمل ایک معینہ نظام کے تحت ہے، ہر وجود کو ہر حالت میں زندگی اور بقا کے لئے جو کچھ مطلوب تھا۔ وہ سب کچھ مل رہا ہے، چیونٹی زمین پر

رینگ رہی ہے، کیڑے مکوڑے، کوڑے کرکٹ میں اپنا راستہ پیدا کر لیتے ہیں۔ مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں، پرند ہوا میں اڑ رہے ہیں، پھول باغوں میں کھل رہے ہیں، ہاتھی جنگل میں جھوم رہے ہیں، اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں۔ لیکن فطرت کے پاس یکساں طور پر سب کے لئے پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضان ربوبیت سے محروم ہو۔ مخلوقات کی بے شمار قسمیں ایسی بھی ہیں جو اتنی حقیر اور بے مقدار ہیں کہ ہماری آنکھ انہیں دیکھ بھی نہیں سکتی لیکن ربوبیت الٰہی نے جس طرح اور جس نظام کے ساتھ ہاتھی جیسی جسیم مخلوق کے لئے سامان پرورش و نگہداشت مہیا کر دیا ہے ٹھیک اسی طرح اور ویسے ہی نظام کے ساتھ ان کے لیے بھی زندگی اور بقا کی ہر چیز مہیا کر دی اور بوجھ ہے انسان کے وجود ... ہر ہے، اگر انسان اپنے وجود کو دیکھے تو خود اس کی زندگی اور زندگی کا ہر نحہ ربوبیت الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝

(۵۱: ۲۰: ۲۱)

ان لوگوں کے لئے جو (سچائی پر) یقین رکھنے والے ہیں زمین میں (خدا کی کارفرمائیوں کی کتنی بڑی) نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی۔ پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

خارجی پہلو

سامان زندگی کی بخشائش اور ربوبیت کے عمل میں جو فرق ہے قرآن اس فرق کو واضح کرتا ہے۔ دنیا میں ایسے عناصر، ایسی قوتیں اور ان کی ایسی مختلف شکلیں اور بناوٹیں موجود ہیں جو زندگی

کی ترقی اور نشوونما کے لئے سودمند ہیں لیکن محض ان کی موجودگی ربوبیت سے تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ ایسا ہونا قدرت الٰہی کی رحمت ہے مگر وہ بات نہیں جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت یہ ہے کہ ان اشیاء کی بخشش و تقسیم کا بھی ایک نظام موجود ہے مثلاً زندگی کے لئے پانی اور رطوبت کی ضرورت ہے لیکن پانی کی موجودگی بجائے خود زندگی کے لئے کافی نہیں جب تک کہ ایک مقررہ مقدار اور ایک خاص وقت و انتظام کے ساتھ پانی موجود نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اللہ کی رحمت ہے جس نے پانی جیسا جوہر حیات پیدا کر دیا لیکن یہ اس کی ربوبیت ہے جو پانی کو ایک ایک بوند کر کے ٹپکاتی۔ زمین کے گوشے گوشے تک پہنچاتی۔ ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی۔ ایک خاص موسم اور محل میں برساتی اور پھر زمین کے ایک ایک تشنہ ذرے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سیراب کر دیتی ہے۔

وَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسۡكَنّٰهُ فِى الۡاَرۡضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوۡنَ فَاَنۡشَاۡنَا لَـكُمۡ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ لَـكُمۡ فِيۡهَا فَوَاكِهُ كَثِيۡرَةٌ وَّمِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ

(۲۳: ۱۸، ۱۹)

اور (دیکھو) ہم نے آسمان سے ایک خاص انداز کے ساتھ پانی برسایا پھر اسے زمین میں ٹھہرائے رکھا اور ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ (جس طرح برسایا تھا اسی طرح) اسے واپس لے جائیں، پھر (دیکھو) اسی پانی سے ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کر دیئے جن میں بے شمار پھل لگتے ہیں اور انہیں سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو۔

قرآن نے جا بجا اشیاء کی قدر اور مقدار کا ذکر کیا ہے یعنی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فطرت کائنات جو کچھ بخشتی ہے ایک خاص اندازہ کے ساتھ بخشتی ہے اور یہ اندازہ ایک خاص نظام کے تحت ہوتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۲۱:۱۵)

اور کوئی شے نہیں جس کے ہمارے پاس ذخیرے موجود نہ ہوں لیکن ہمارا طریق کار یہ ہے کہ) جو کچھ نازل کرتے ہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں

وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَارٍ (۱۳:۸)

اور اللہ کے نزدیک ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے۔

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ (۵۴:۴۹)

ہم نے جتنی چیزیں بھی پیدا کی ہیں ایک اندازہ کے ساتھ پیدا کی ہیں۔

غور کیجئے! دنیا میں صرف یہی نہیں ہے کہ پانی موجود ہے بلکہ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ موجود ہے یہ کیوں ہے کہ پہلے سورج کی شعاعیں سمندر سے ڈول بھر بھر کو فضا میں پانی کی چادریں بچھا دیں پھر ہواؤں کے جھونکے انہیں حرکت میں لائیں اور پانی کی بوندیں بنا کر ایک خاص وقت اور خاص محل میں برسائیں۔ پھر یہ کیوں ہے کہ جب کبھی پانی برسے تو ایک خاص ترتیب اور مقدار ہی سے برسے اور اس طرح برسے کہ زمین کی بالائی سطح پر اس کی ایک خاص مقدار بہنے لگے اور ایک خاص مقدار زمین کے اندرونی حصوں میں جذب ہو جائے۔ کیوں ایسا ہوتا ہے کہ پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے

تودے جمتے ہیں اور پھر موسم کی تبدیلی سے پگھلنے لگتے ہیں۔ پھر ان کے پگھلنے سے پانی کے سرچشمے ابلنے لگتے ہیں۔ پھر چشموں سے دریا کی جدولیں بہنے لگتی ہیں۔ پھر یہ جدولیں پیچ و خم کھاتی ہوئی دور دور تک دوڑ جاتی ہیں اور سینکڑوں ہزاروں میلوں تک زمین کو سیراب کر دیتی ہیں؟

کیوں یہ سب کچھ ایسا ہی ہوا، کیوں کسی دوسرے انداز سے نہ ہوا؟ قرآن اس کا جواب دیتا ہے۔ اس لئے کہ کائنات ہستی میں ربوبیت الٰہی کارفرما ہے اور ربوبیت کا مقتضیٰ یہی تھا کہ پانی اسی ترتیب سے بنے اور اسی ترتیب و تقداد سے تقسیم ہو۔ یہ رحمت و حکمت تھی جس نے پانی پیدا کیا لیکن یہ ربوبیت ہے جو اسے اس طرح کام میں لائی کہ ہر مخلوق کی پرورش اور رکھوالی کی ضرورتیں پوری ہو گئیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ کَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ کِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۰: ۴۸)

اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ پہلے ہوائیں چلتی ہیں پھر ہوائیں بادلوں کو ابھار کر حرکت میں لاتی ہیں۔ پھر وہ جس طرح چاہتا ہے انہیں فضا میں پھیلا دیتا ہے اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ بادلوں میں سے مینہ نکل رہا ہے۔ پھر جن لوگوں کو بارش کی یہ برکت ملنی تھی مل چکتی ہے تو اچانک خوش وقت ہو جاتے ہیں۔

زندگی کے لئے جن چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی انہی کی بخشائش سب سے زیادہ اور عام ہے اور اسی طرح جن کی ضرورت خاص خاص حالتوں میں یا خاص خاص موقعوں کے لئے تھی ان میں اختصاص اور مقاہیت پائی جاتی ہے، ہوا سب سے زیادہ ضروری تھی کیونکہ پانی اور غذا کے بغیر کچھ عرصہ تک زندگی ممکن ہے مگر ہوا کے بغیر ممکن نہیں پس اس کا سامان اتنا وافر اور عام ہے کہ زمین کا کوئی گوشہ نہیں جو کسی وقت بھی اس سے خالی ہو، ہوا کے بعد دوسرے درجہ پر پانی ہے اس لئے اس کی بخشائش کی فراوانی اور عمومیت کا درجہ ہوا کے بعد ہے، دنیا کے ہر حصہ میں زمین کے اوپر ہر طرف دریا رواں ہیں اور زمین کے نیچے بھی پانی کے سوتے بہہ رہے ہیں پھر ان دونوں ذخیروں کے علاوہ فضائے آسمانی کا بھی کارخانہ ہے جو شب و روز سرگرم کار رہتا ہے، وہ سمندر کا شورابہ کھینچتا ہے اسے صاف و شیریں بنا کر جمع کرتا رہتا ہے پھر حسب ضرورت زمین کے حوالے کر دیتا ہے ہوا اور پانی کے بعد غذا کی ضرورت تھی لہذا ہوا اور پانی سے کم مگر اور تمام چیزوں سے زیادہ اس کا دسترخوان کرم بوئے کرۂ ارض پر بچھا ہوا ہے۔ اور کوئی مخلوق نہیں جس کے گرد و پیش اس کی غذا کا ذخیرہ موجود نہ ہو۔

پھر سامان پرورش کے اس عالمگیر نظام پر غور کرو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام کارخانہ صرف اس لئے بنا ہے کہ زندگی بخشے اور زندگی کی ہر استعداد کی رکھوالی کرے، سورج اس لئے ہے کہ روشنی کے لئے چراغ

اور گرمی کے لئے تنور کا کام دے اور اپنی کرنوں کے ڈول بھر بھر کر سمندر سے پانی کھینچتا رہے، ہوائیں اس لئے ہیں کہ اپنی سردی اور گرمی سے مطلوبہ اثرات پیدا کرتی رہیں، کبھی پانی کے ذرات جما کر ابر کی چادریں بنا دیں اور کبھی ابر کو پانی بنا کر برسا دیں، زمین اس لئے ہے کہ نشو و نما کے خزانوں سے ہمیشہ معمور رہے اور ہر دانے کے لئے اپنی گود میں زندگی اور ہر پودے کے لئے اپنے سینے میں پرورش رکھے۔ مختصر یہ کہ کارخانہ ہستی کا ہر گوشہ صرف اسی کام میں لگا ہوا ہے، ہر قوت اپنی استعداد کا مظاہرہ کر رہی ہے اور ہر علت اپنی تاثیر کے اظہار میں لگی ہوئی ہے جوں ہی کسی وجود میں بڑھنے اور نشو و نما پانے کی استعداد پیدا ہوتی ہے معاً تمام کارخانہ ہستی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، سورج کی تمام کارفرمائیاں فضا کے تمام تغیرات زمین کی تمام قوتیں اور عناصر کی تمام سرگرمیاں صرف اسی انتظار میں رہتی ہیں کہ کب چیونٹی کے انڈے سے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اور کب دہقان کی جھولی سے ایک دانہ زمین پر گرتا ہے۔

لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵ : ۱۳)

اور آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے سب کو اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا، بلا شبہ ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس بات میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب مگر سب سے زیادہ

نمایاں حقیقت نظام ربوبیت کی یکسانیت اور ہم آہنگی ہے یعنی ہر وجود کی پرورش کا سروسامان جس طرح اور جس اسلوب پر کیا گیا ہے وہ ہر گوشے میں ایک ہی ہے اور ایک ہی اصل و قاعدہ رکھتا ہے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا گلاب کے شاداب اور معطر پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے لیکن دونوں کو ایک ہی طریقہ سے سامان پرورش ملا ہے اور دونوں ایک ہی طرح سے پالے پوسے جا رہے ہیں۔ ایک انسان کا بچہ اور درخت کا ایک پودا، بظاہر دو الگ الگ حیثیتوں کے مظہر دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی نشو ونما کے طریقوں کا کھوج لگانے سے پتہ چلتا ہے کہ قانونِ پرورش کی یکسانیت نے دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا ہے۔ پتھر کی چٹان ہو یا پھول کی کلی، انسان کا بچہ ہو یا چیونٹی کا انڈا سب کے لئے پیدائش کا وقت مقرر ہے اور قبل اس کے کہ پیدائش ظہور میں آئے سامانِ پرورش مہیا ہو جاتا ہے پھر یکے بعد دیگرے طفولیت، رشد و بلوغ، شباب، سن کمال اور بالآخر ضعف و انحطاط کی منزلیں آتی ہیں، زندگی کے ظہور، نشو و نما اور زوال و انحطاط کا افسوں سب کے لئے یکساں ہے:۔

اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّۃً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّۃٍ ضُعْفًا وَّشَیْبَۃً یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَھُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ
(۳۰ : ۵۴)

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا ہے کہ پہلے ناتوانی کی حالت ہوتی پھر ناتوانی کے بعد قوت آتی ہے پھر قوت کے بعد دوبارہ ناتوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے، وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے

وہ علم اور قدرت رکھنے والا ہے

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنزَلَ مِنَ
السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ
فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ
زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ
فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ
حُطَامًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ
لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ (٣٩:٢١)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے
پانی برسایا زمین میں اس کے چشمے رواں
ہوگئے۔ پھر اسی پانی سے رنگ برنگ کی کھیتیاں
لہلہا اٹھیں پھر ان کی نشو و نما میں ترقی
ہوئی اور پوری طرح پک کر تیار ہوگئیں
پھر ترقی کے بعد زوال طاری ہوا (اور)
تم دیکھتے ہو کہ ان پر زردی چھا گئی بالآخر
خشک ہو کر چورہ چورہ ہوگئیں۔ بلا شبہ
دانشمندوں کے لئے اس صورت حال
میں بڑی ہی عبرت ہے۔

جہاں تک غذا کا تعلق ہے، حیوانات میں ایک قسم ان جانوروں کی ہے جن کے بچے دودھ سے پرورش پاتے ہیں اور ایک ان کی ہے جو عام غذاؤں سے پرورش پاتے ہیں۔ غور کرو نظام ربوبیت نے دونوں کی پرورش کے لئے کیسا عجیب سرو سامان مہیا کر دیا ہے۔ انسان کو لے لو، جوں ہی وہ پیدا ہوتا ہے اس کی غذا اپنی ساری مناسبتوں اور رعنائیوں کے ساتھ خود بخود مہیا ہو جاتی ہے اور ایسی جگہ مہیا ہوتی ہے جو اس کے لئے سب سے قریب اور موزوں ہوتی ہے، ماں اپنے نومولود بچے کو جوش محبت میں سینے سے لگا لیتی ہے اور وہیں اس کی غذا کا سرچشمہ بھی موجود ہوتا ہے۔ پھر دیکھو! اس غذا کی نوعیت اور

مزاج میں اس کی حالت کا درجہ بدرجہ کس قدر لحاظ رکھا گیا ہے اور کس طرح یکے بعد دیگرے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ابتدا میں بچہ کا معدہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اسے بہت ہی ہلکے قوام کا دودھ ملنا چاہیئے چنانچہ نہ صرف انسان میں بلکہ تمام حیوانات میں ماں کا دودھ بہت ہی پتلے قوام کا ہوتا ہے لیکن جوں جوں بچے کی عمر اور معدہ قوی ہوتا جاتا ہے دودھ کا قوام بھی بدلتا جاتا ہے یہاں تک کہ بچے کا عہد رضاعت پورا ہو جاتا ہے اور اس کا معدہ عام غذاؤں کے ہضم کرنے کی استعداد پیدا کر لیتا ہے اور اس منزل پر ماں کا دودھ خشک ہونا شروع ہو جاتا ہے، یہ گویا ربوبیت الٰہی کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب اس کے لئے دودھ کی ضرورت نہیں رہی بلکہ وہ ہر طرح کی غذا استعمال کر سکتا ہے۔

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ (۴۶ : ۱۵)

اس کی ماں نے اسے تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت (کم از کم) تیس مہینوں کی ہے۔

پھر دیکھو! کارساز فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے، محبت مادری کا یہ شعلہ خود بخود دھیما پڑتا جاتا ہے یہ محبت مادری ہے جو ماں کے دل میں شریف ترین جذبات کو نشوونما دیتی ہے اور اپنے بچے کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتی پھر جوں جوں بچہ بڑھتا جاتا ہے محبت مادری کے جذبہ کی شدت کم ہوتی جاتی ہے

اور پھر ایک وقت آتا ہے جبکہ یہ جذبہ حیوانات میں تو بالکل باقی نہیں رہتا لیکن انسان میں بھی اس کی گرمجوشیاں باقی نہیں رہتیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بچے کے پیدا ہونے ہی محبت کا ایک عظیم ترین جذبہ ماں کے دل میں موجزن ہو جائے اور پھر ایک خاص وقت تک قائم رہ کر رفتہ رفتہ غائب ہو جائے! اس لئے کہ نظام ربوبیت کی کارفرمائی ہے اور اس کا مقتضیٰ یہی تھا، ربوبیت چاہتی ہے کہ جب تک بچہ کو پرورش کی احتیاج باقی رہے اس کی پرورش ہو اس لئے ماں کی محبت میں بھی بچے کی پرورش کا جوش اتنا ہی زیادہ تھا جب بچے کی عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ ماں کی پرورش کی احتیاج باقی نہ رہی تو اس جذبہ کی ضرورت بھی باقی نہ رہی، اب اس کا باقی رہنا ماں کے لئے بوجھ اور بچے کی نشو ونما کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے، بچے کی احتیاج کا سب سے نازک وقت اس کی نئی نئی طفولیت تھی اس لئے ماں کی محبت میں بھی سب سے زیادہ جوش اسی وقت تھا، پھر جوں جوں بچہ بڑھتا گیا یہ احتیاج کم ہوتی گئی بلا شبہ ماں کی محبت اپنے بچے کے لئے ہمیشہ زندہ رہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے، لیکن اس کا محض ایک سماجی قدر ہوتی ہے، بچے کی طفولیت کے عہد میں محبت مادری کا جو فطری اور جبلی جوش ہوتا ہے وہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

انسان اور حیوانات کے بچوں کی پرورش میں ضرور تھوڑا سا فرق ہوتا ہے، مثلاً جب انڈے سے مرغی کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی جسمانی ساخت اور طبیعت دودھ پینے والے بچوں سے مختلف ہوتی ہے وہ اول دن سے ہی معمولی اور عام غذائیں کھا سکتے ہیں بشرطیکہ کھلانے کے لئے کوئی شفیق

نگرانی موجود ہو۔ چنانچہ جوں ہی مرغی کا بچہ انڈے سے نکلتا ہے اپنی غذا ڈھونڈنے لگتا ہے اور ماں چن چن کر غذا اس کے سامنے ڈالتی جاتی ہے اور منہ میں دے کر کھلانے کا طریقہ بتاتی جاتی ہے یا ایسا کرتی ہے کہ خود کھا لیتی ہے مگر ہضم نہیں کرتی۔ اپنے اندر اسے ہلکا نرم بنا کر محفوظ رکھتی ہے اور جب بچہ اپنی غذا کے لئے منہ کھولتا ہے تو اس میں اتار دیتی ہے۔

ربوبیت معنوی پھر اس سے بھی عجیب تر نظام ربوبیت کا معنوی پہلو ہے۔ خارج میں زندگی اور پرورش کا کتنا ہی سر و سامان کیا جاتا۔ مفید نہیں ہو سکتا تھا اگر ہر وجود کے اندر اس سے کام لینے کی ٹھیک ٹھیک استعداد ودیعت نہ ہوتی پس یہ ربوبیت ہی کا فیضان ہے کہ ہر مخلوق کی ظاہری اور باطنی بناوٹ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس کی ہر قوت اس کے سامان پرورش کی نوعیت کے مطابق ہوتی ہے اور اس کی ہر چیز اسے زندہ رہنے اور نشو و نما پانے میں مدد دیتی ہے۔ کوئی مخلوق اپنے جسم و قوٰی کی ایسی نوعیت نہیں رکھتی جو اس کے حالات پرورش کے تقاضوں کے خلاف ہو۔

اس سلسلہ میں مولانا آزاد نے زندگی کی دو حقیقتوں کو نمایاں کیا ہے جن کی طرف قرآن نے بار بار متوجہ کیا ہے، ایک وہ ہے جسے تقدیر کہتے ہیں انگریزی میں اس کے قسمت کا عام سا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور دوسری حقیقت عبارت ہے "ہدایت" سے۔

تقدیر تقدیر کے معنی کسی چیز کے لئے ایک خاص طرح کی حالت ٹھیرا دینے کے ہیں، خواہ یہ ٹھیراؤ کمیت میں ہو یا کیفیت میں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت نے ہر وجود کی جسمانی ساخت اور معنوی قوی کے لئے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھیرا دیا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتا اور یہ اندازہ ایسا ہے جو اس کی زندگی اور نشوونما کے تمام احوال و ظروف سے ٹھیک ٹھیک مناسبت رکھتا ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵ : ۲)

اور اس نے تمام چیزیں پیدا کیں پھر ہر چیز کے لئے (اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق) ایک خاص اندازہ ٹھیرا دیا

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا بات ہے کہ ہر گردوپیش میں اس کی پیداوار میں ہمیشہ مطابقت پائی جاتی ہے اور ایسا کیوں ہے کہ ہر مخلوق کی اپنی ظاہری و باطنی بناوٹ بھی ویسی ہی ہوتی ہے جیسا کہ اس کا گردوپیش ہے اور ہر گردوپیش ویسا ہی ہوتا ہے جیسی اس کی مخلوقات ہوتی ہے؟ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ یہ اس کے حکیم و قدیر کی ٹھیرائی ہوئی تقدیر ہے اور اس نے ہر چیز کی خلقت و زندگی کے لئے ایسا ہی اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ اس کا یہ قانونِ تقدیر صرف حیوانات و نباتات کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ کائناتِ ہستی کی ہر چیز کے لئے ہے یہاں تک کہ سیاروں کا نظام بھی اسی سے وابستہ ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ (۳۶ : ۳۸)

اور (دیکھو) سورج کیلئے جو قرارگاہ ٹھیرا دی گئی ہے، وہ اسی پر چلتا ہے اور یہ عزیز و

علیم خدا کی اس کی تقدیر سے
مخلوقات اور اس کے گرد و پیش کی مطابقت کا یہی قانون ہے جس نے دونوں میں باہم گہرا مناسبت پیدا کر دی ہے۔ اور ہر مخلوق اپنے چاروں طرف وہی پاتی ہے جس میں اس کے لئے پرورش اور نشو و نما کا سامان ہوتا ہے۔ اڑنے والا پرند، تیرنے والی مچھلی چلنے والے چوپائے، رینگنے والے حشرات ان میں سے ہر ایک کو ویسا ہی جسم ملا ہے جو اس کے گرد و پیش کے لئے موزوں ہے، دریا میں پرند نہیں پیدا ہوتا اس لئے کہ یہ گرد و پیش اس کے تقاضائے پرورش کے مطابق نہیں، خشکی میں مچھلی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ خشکی اس کی حیات کے لئے موزوں نہیں۔ اگر فطرت کی اس تقدیر کے خلاف ایک خاص گرد و پیش کی مخلوق دوسرے قسم کے ماحول میں چلی جاتی ہے تو یا تو وہاں زندہ نہیں رہتی یا زندہ رہتی ہے تو پھر بتدریج اس کی جسمانی ساخت اور طبیعت بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسی اس گرد و پیش میں ہونی چاہیئے پھر ان میں سے ہر نوع کے لئے مقامی موثرات کے مختلف گرد و پیش ہیں۔ سرد آب و ہوا کی پیداوار سرد آب و ہوا کے لئے ہی ہے اور گرم آب و ہوا کی مخلوق گرم آب و ہوا کے لئے ہے، قطب شمالی کے قرب و جوار کا ریچھ خط استوا کے قریب میں نظر نہیں آسکتا اور منطقۂ حارہ کے جانور منطقۂ باردہ میں مفقود ہیں اور یہی قانون فطرت یا قانون تقدیر ہے، آیئے اب ہم ربوبیت کے دوسرے عنصر یعنی ہدایت پر نظر ڈالیں

ہدایت ہدایت کے معنی راہ دکھانے، راہ پر لگانے، رہنمائی کرنے کے ہیں اور اس کے مختلف مراتب و اقسام ہیں جن کی تفصیل آگے آئے گی یہاں

صرف اس ابتدائی مرتبۂ ہدایت کا ذکر کرنا ہے جو تمام مخلوقات پر ان کی پرورش کی ضروری راہیں کھولنا۔ انہیں زندگی کی راہ پر لگاتا اور ضروریاتِ زندگی کی طلب و حصول میں رہنمائی کرتا ہے، فطرت کی یہ ہدایت ربوبیت کی ہدایت ہے اور اگر یہ ہدایت ربوبیت کی دستگیر نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ کوئی مخلوق بھی دنیا کے سامانِ حیات و پرورش سے فائدہ اٹھا سکتی اور زندگی کی سرگرمیاں ظہور میں آسکتیں، اس کے بغیر سازِ ہستی ہی خاموش ہو جاتا، قرآن کہتا ہے کہ یہ ہدایت وجدان کا فطری الہام اور حواس و ادراک کی قدرتی استعداد ہے، یہ فطرت کی وہ رہنمائی ہے جو ہر مخلوق کے اندر پہلے وجدان کا الہام بن کر نمودار ہوتی ہے پھر حواس و ادراک کا چراغ روشن کر دیتی ہے، یہی وہ باطنی قوت ہے جو ہر مخلوق کو زندگی اور پرورش کی راہوں پر لگا دیتی ہے انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا جوں ہی شکمِ مادر سے باہر آتا ہے جبلی طور پر معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں ہے اور جب پستان منہ میں لیتا ہے تو خود بخود انہیں چوسنا شروع کر دیتا ہے، بلی کے بچوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں، ان کی آنکھیں بھی نہیں کھلی ہیں لیکن ماں جوشِ محبت میں انہیں چاٹ رہی ہے اور وہ اس کے سینے پر منہ مار رہے ہیں۔ یہ بچہ جس نے عالمِ ہستی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے جسے خارج کے مؤثرات نے چھوا تک نہیں، جبلی طور پر معلوم کر لیتا ہے کہ اسے پستان منہ میں لینا چاہیئے اور اس کی غذا کا سرچشمہ یہیں ہے۔ یہی وہ وجدانی ہدایت ہے جو قبل اس کے کہ حواس و ادراک کی روشنی نمودار ہو بچے کو اس کی پرورش و زندگی کی راہوں پر لگا دیتی ہے۔

اگر تمہارے گھر میں بلی ہے تو تم نے دیکھا ہوگا کہ جب وہ حاملہ ہوتی ہے تو کیا کرتی ہے؟ سمجھو کہ وہ پہلی مرتبہ حاملہ ہوئی ہے، اس حالت کا اسے کوئی تجربہ نہیں لیکن جوں ہی وضع حمل کا وقت قریب آتا ہے وہ کسی محفوظ گوشے کی جستجو شروع کر دیتی ہے اور کسی مناسب جگہ کے لئے مکان کا ایک ایک کونہ دیکھتی پھرتی ہے پھر خود بخود ایک علیحدہ اور محفوظ ترین گوشہ چھانٹ لیتی ہے اور وہاں بچہ دیتی ہے پھر یکایک اس کے اندر بچے کی حفاظت کی طرف سے ایک مجہول خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یکے بعد دیگرے اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے، یہ کون سی قوت ہے جو بلی کے اندر یہ خیال پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنے پیدا ہونے والے بچے کے لئے کوئی محفوظ جگہ تلاش کرے کیونکہ عنقریب اسے ایسی جگہ کی ضرورت ہوگی؟ یہ کونسا الہام ہے جو اسے خبردار کر دیتا ہے کہ بلا بچوں کا دشمن ہے اور ان کی بو سونگھتا پھرتا ہے اس لئے جگہ بدلتے رہنا چاہیئے، بلاشبہ یہ ربوبیت الٰہی کی وجدانی ہدایت ہے جس کا الہام ہر مخلوق کے اندر اپنی نمود رکھتا ہے اور جو ان پر زندگی اور پرورش کی تمام راہیں کھول دیتا ہے۔

ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور مدرکات ذہنی کی ہدایت ہے، اگرچہ حیوانات اس جوہر دماغ سے محروم ہیں جسے فکر و عقل سے تعبیر کیا جاتا ہے تاہم فطرت نے انہیں بھی ان کی ضرورت کے مطابق احساس و ادراک کی اتنی قوت عطا کر دی ہے جو انہیں اپنی زندگی اور معیشت کے لئے درکار تھی اور جس کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، توالد و تناسل اور حفاظت و نگرانی کے تمام وظائف حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں لیکن حواس و ادراک کی

یہ ہدایت ہر حیوان کے لئے ایک ہی طرح کی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو اس کی ضرورت اور مقتضیات کے مطابق عطا کی گئی ہے، چیونٹی کی قوت شامہ بہت دور رس ہوتی ہے، اس لئے کہ اسی قوت کے ذریعہ اسے اپنی غذا حاصل کرنا ہوتی ہے، چیل اور عقاب کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں پرواز کرتے ہوئے اپنا شکار نہ دیکھ سکیں، یہ سوال بالکل غیر ضروری ہے کہ حیوانات کے حواس و ادراک کی یہ حالت اول دن سے تھی یا احوال و ظروف کی ضروریات اور قانونِ مطابقت کے مؤثرات سے بتدریج ظہور میں آئی ہے۔ اس لئے کہ خواہ کوئی صورت ہو بہر حال یہ فطرت کی بخشی ہوئی استعداد ہے۔

اب یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ قرآن کے مطابق ہر مخلوق کے لئے اس کی پرورش و معیشت کا ایک مکمل نظام کارفرما ہے جو ربوبیت الٰہی کا مظہر ہے یہی ربوبیت الٰہی ہے جس نے ہر وجود کو اس کی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے مناسب و موزوں سامان پرورش (تسویہ) عطا کیا اور ہر مخلوق کے لئے اس کے خواص کے مطابق ایک خاص طرح کا اندازہ (تقدیر) ٹھیرا دیا۔ اور پھر ہر مخلوق کو ایک ایسا خارجی اور معنوی ادراک (ہدایت) بخشا کہ وہ دنیا کے سامان حیات سے پرورش و معیشت کا پوری طرح فائدہ اٹھا سکے۔ قرآن نے ربوبیت کے ان مراتب کا بطور خاص ذکر کیا ہے، قرآن کہتا ہے:۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۙ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (۸۷: ۲: ۳)	وہ پروردگار عالم جس نے پیدا کیا پھر اسے ٹھیک ٹھیک درست کر دیا اور جس نے

ہر وجود کے لئے ایک اندازہ ٹھیرا دیا۔ پھر
اس پر راہ (عمل) کھول دی۔

غایت حقیقی اس طرح قرآن نے ان مظاہر تخلیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو کائنات حیات میں سرگرم عمل ہیں، ربوبیت الٰہی کے مراتب بیان کئے ہیں جس کی غرض وغایت یہ ہے کہ نہ صرف توحید الٰہی کا ثبوت فراہم کیا جائے بلکہ ذہن انسانی پر یہ امر بھی آشکارا کر دیا جائے کہ کائنات خلقت اور اس کی ہر مخلوق کی بناوٹ کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ایک خاص مقصد کے تحت ایک خاص نظام و قانون میں باہمد گر منسلک ہے اور کوئی چیز نہیں جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو۔

خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ٥ (۲۹ : ۴۴)

اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت اور مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور بلاشبہ اس بات میں ارباب ایمان کے لئے (معرفت حق کی) ایک بڑی ہی نشانی ہے

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا (۳ : ۱۹۱)

اے ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے اس لئے نہیں پیدا کیا ہے کہ محض ایک بیکار و عبث سا کام ہو۔

تخلیق ہستی کے اس مقصدی پہلو کو مولانا آزاد نے "تخلیق بالحق" سے تعبیر کیا ہے۔ "بالحق" کا لفظ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے جس کا مقصد اس بات پر توجہ دلانا ہے کہ کائنات ہستی کی کوئی چیز ایسی نہیں جس میں زندگی کے لئے

افادہ و فیضان نہ ہو، فطرت خود یہ چاہتی ہے کہ جو کچھ وہ بنائے اس طرح بنائے کہ اس میں وجود اور زندگی کے لئے نفع و راحت ہو:-

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
يُكَوِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَيُكَوِّرُ
النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِىْ
لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ (۳۹ : ۵)

اس نے آسمانوں اور زمینوں کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اس نے رات اور دن کے اختلافات اور ظہور کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن پر لپٹی جاتی ہے اور دن رات پر لپٹا آتا ہے اور سورج اور چاند دونوں کو اس کی قدرت نے مسخر کر رکھا ہے، سب (اپنی اپنی جگہ) اپنے مقررہ وقت تک کے لئے گردش کر رہے ہیں

هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الشَّمْسَ
ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ
مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ
وَالْحِسَابَ ۭ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ
اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۱۰ : ۵)

وہ (کارفرمائے قدرت) جس نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو روشن بنایا اور پھر چاند کی گردش کے لئے منزلیں ٹھیرا دیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور اوقات کا حساب معلوم کرلو۔ بلاشبہ اللہ نے یہ سب کچھ پیدا نہیں کیا ہے مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ وہ ان لوگوں کے لئے جو جاننے والے ہیں (علم و معرفت کی) نشانیاں الگ الگ کرکے واضح کر دیتا ہے

فطرت کے جمال و زیبائی کے لئے بھی "بالحق" کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی فطرتِ کائنات میں تحسین و آرائش کا قانون کام کر رہا ہے جو چاہتا ہے کہ جو کچھ بنے ایسا بنے کہ اس میں حسن و جمال اور خوبی و کمال ہو:۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (۶۴ : ۳)

اس نے آسمانوں کو اور زمینوں کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا اور تمہاری صورتیں بنائیں تو نہایت حسن و خوبی سے بنائیں۔

اسی طرح وہ قانونِ مجازات پر (یعنی جزا و سزا کے قانون پر) اسی تخلیق بالحق سے استشہاد کرتا ہے۔ دنیا میں ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ رکھتی ہے جو اپنے عمل سے ایک خاص نتیجہ پیدا کرتی ہے اور یہ تمام خواص و نتائج لازمی اور اٹل ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ انسانی اعمال میں بھی اچھے اور برے خواص نہ ہوں اور ان کے ویسے ہی نتائج برآمد نہ ہوں جو قانونِ فطرت دنیا کی ہر چیز میں اچھے برے کا امتیاز رکھتا ہے کیا انسان کے اعمال میں امتیاز سے غافل ہو جائے گا؟

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ

جو لوگ برائیاں کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں ہم انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ یعنی دونوں برابر ہو جائیں زندگی میں بھی اور موت میں بھی؟ اگر ان لوگوں کی فہم و دانش کا فیصلہ یہی ہے تو کیا ہی برا ان کا فیصلہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ

بِمَا کَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ

(۲۲:۲۱:۴۵)

اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہر جان اپنی کمائی کے مطابق بدلہ پائے اور ایسا نہیں ہوگا کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہو۔

معاد یا مرنے کے بعد کی زندگی پر بھی اسی "تخلیق بالحق" سے استشہاد کیا گیا ہے، کائنات کی ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ رکھتی ہے پس ضروری ہے کہ انسانی وجود کے لئے بھی کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ ہو اور یہ منتہیٰ آخرت کی زندگی ہے کیونکہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ کائنات ارضی کی بہترین مخلوق صرف اسی لئے پیدا کی گئی ہو کہ پیدا ہو اور چند دن جی کر فنا ہو جائے۔

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ وقف مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ؕ (۸:۳۰)

کیا ان لوگوں نے کبھی اپنے دل میں اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے محض بیکار و عبث نہیں بنایا ہے، ضروری ہے کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہو اور اس کے لئے ایک مقررہ وقت ٹھیرا دیا ہو اصل یہ ہے کہ انسانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروردگار

کی ملاقات سے یک قلم منکر ہیں۔

ربوبیت:۔ توحید پر استدلال اس موقع پر یہ بات بطور خاص قابل غور ہے کہ قرآن نے مظاہر کائنات کے جن مقاصد و مصالح سے استدلال کیا ہے ان میں سب سے زیادہ عام استدلال ربوبیت کا استدلال ہے۔ مثلاً توحید باری کے تعلق سے اس کا استدلال یہ ہے کہ کائنات کے تمام اعمال و مظاہر کا اس طرح واقع ہونا کہ ہر چیز پرورش کرنے والی اور ہر تاثیر زندگی بخشنے والی ہے اور پھر ایک ایسے نظام ربوبیت کا موجود ہونا جو ہر حالت کی رعایت کرتا اور ہر طرح کی مناسبت ملحوظ رکھتا ہے۔ ہر انسان کو وجدانی طور پر یقین دلاتا ہے کہ ایک ہستی موجود ہے جو ساری کائنات کو زندگی بخشتی ہے اور تمام مخلوقات کی پرورش کرتی ہے اور اسی لئے ایسی تمام صفات سے متصف ہے جس کی جلوہ آرائی کے بغیر نظام کائنات کا ایسا کامل اور بے عیب کارخانہ ہرگز وجود میں نہیں آسکتا تھا۔

وہ سوال کرتا ہے کہ: انسانی وجدان یہ باور کر سکتا ہے کہ نظام حیات کا یہ کارخانہ خود بخود عالم وجود میں آگیا ہے اور کوئی ارادہ کوئی حکمت اس کے اندر کارفرما نہیں ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کارخانہ وجود کا کوئی کارساز نہ ہو؟ کیا یہ پورا نظام حیات محض ایک اندھی بہری فطرت بے جان مادے اور بے حس الکٹرون کا مظہر ہے اور عقل و ارادہ رکھنے والی کوئی ہستی موجود نہیں ہے؟

اگر ایسا ہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پروردگاری اور کارسازی کا عمل تو ہر جگہ موجود ہے مگر کوئی پروردگار اور کارساز موجود نہیں۔ نظم موجود ہے مگر ناظم موجود نہیں، رحمت موجود ہے مگر کوئی رحیم موجود نہیں۔ یعنی سب کچھ موجود ہے مگر کوئی موجود نہیں۔ انسان کی فطرت مشکل ہی سے یہ باور کر سکتی ہے کہ عمل کے بغیر کسی عامل کے، نظم بغیر کسی ناظم کے، قیام بغیر کسی قیوم کے، عمارت بغیر کسی معمار کے، نقش بغیر نقاش کے یعنی سب کچھ بغیر کسی موجود کے ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ اس کا وجدان پکار اٹھتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اس کی فطرت اپنی بناوٹ میں ایک ایسا سانچہ لے کر آئی ہے جس میں یقین و ایمان ہی ڈھل سکتا ہے شک اور انکار کی اس میں سمائی نہیں۔

قرآن کہتا ہے یہ بات انسان کے وجدانی اذعان کے خلاف ہے کہ وہ نظام کائنات کا مطالعہ کرے اور ایک ایسی ہستی کا یقین جو رب العلمین ہے اس کے اندر جاگ نہ اٹھے۔ وہ کہتا ہے کہ غفلت کی سرشاری اور سرکشی کے ہیجان میں انسان ہر چیز کا منکر ہو سکتا ہے لیکن اپنی فطرت سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ ہر چیز کے خلاف جنگ کر سکتا ہے لیکن اپنی فطرت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکتا۔ جب اپنے چاروں طرف زندگی اور پروردگاری کا ایک عالمگیر کارخانہ پھیلا ہوا دیکھتا ہے تو اس کی اپنی فطرت اس کا اندرون صدا دیتا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے ضرور کوئی نہ کوئی اس کا بنانے والا اور پیدا کرنے والا بھی ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کا اسلوب بیان یہ نہیں ہے کہ نظری مقدمات

اور ذہنی مسلمات کی شکلیں ترتیب دے اور پھر ان پر دلیل و برہان کی عمارتیں اٹھائے بلکہ وہ انسان کے فطری وجدان و ذوق سے مخاطب ہوتا ہے، وہ کہتا ہے، خدا پرستی کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے۔ اگر ایک انسان اس سے انکار کرنے لگتا ہے تو یہ اس کی غفلت ہے اور ضروری ہے کہ اسے غفلت سے چونکا دینے کیلئے دلائل پیش کئے جائیں لیکن یہ دلائل ایسے نہیں ہونے چاہئیں جو محض ذہنی کاوشوں کا مظہر ہوں بلکہ ایسے ہونے چاہئیں جو اس کے نہاں خانۂ دل پر دستک دیں اور اس کے فطری وجدان کو بیدار کر دیں، اگر اس کا وجدان بیدار ہو گیا تو پھر اثبات ایمان کے لئے بحث و دلیل کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ بلکہ خود بخود ایمان کی روح اس کے اندر جاگ اٹھے گی یہی وجہ ہے کہ قرآن، خود انسان کی فطرت ہی سے انسان پر حجت لاتا ہے:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ج فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ه فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ج فَمَاذَا بَعْدَ

وہ کون ہے جو آسمان میں پھیلے ہوئے کارخانۂ جہات اور زمین کی وسعت میں پیدا ہونے والے سامان رزق تمہیں روزی بخش رہا ہے؟ وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمہارا سننا اور دیکھنا ہے؟ وہ کون ہے جو بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے؟ پھر وہ کون کی ہستی ہے جو یہ تمام کارخانۂ خلقت اس نظم و نگرانی کے ساتھ چلا رہی ہے؟

الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى
تُصْرَفُوْنَ ۝
(۱۰، ۳۰)

(اے پیغمبر) یقیناً وہ (بے اختیار بول اٹھیں گے) اللہ ہے (اس کے سوا کون ہو سکتا ہے) اچھا تم ان سے کہو جب تمہیں اس بات سے انکار نہیں تو پھر کیوں ایسا ہے کہ غفلت و سرکشی سے نہیں بچتے؟ ہاں بیشک یہ اللہ ہی جو تمہارا پروردگار برحق ہے اور جب یہ حق ہے تو حق کے ظہور کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟ (افسوس تمہاری سمجھ پر) تم (حقیقت سے منہ پھیرائے) کہاں جا رہے ہو؟

ایک دوسرے موقع پہ قرآن پوچھتا ہے :-

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ
مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا
بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ
مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط بَلْ هُمْ
قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝ اَمَّنْ
جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ

وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے تمہارے لئے پانی برسایا پھر اس آبپاشی سے خوشنما باغ اگائے حالانکہ تمہارے بس کی یہ بات نہ تھی کہ ان باغوں کے درخت اگائے؟ کیا (ان کاموں کا کرنے والا) اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ (افسوس ان لوگوں کی سمجھ پر، حقیقت حال کتنی ہی ظاہر ہو) مگر یہ وہ لوگ ہیں جن کا

جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ
لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ
الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ
اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ
اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا
دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ
يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا
تَذَكَّرُوْنَ ؕ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ
فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ
يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا ۢ بَيْنَ
يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ
تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ؕ
اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ
يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ
مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا
بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ۝ (٢٧: ٦١-٦٤)

شیوہ ہی کج روی ہے۔ اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جس نے زمین کو (زندگی و معیشت کا) ٹھکانا بنا دیا اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں اس کی (درستگی کے لئے) پہاڑ بلند کر دیئے اور دو دریاؤں میں (یعنی دریا اور سمندر میں) ایسی دیوار حائل کر دی (کہ دونوں اپنی اپنی جگہ محدود رہتے ہیں) کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ (افسوس! کتنی واضح بات ہے) مگر ان لوگوں میں اکثر ایسے ہیں جو نہیں جانتے! اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جو بیقرار دلوں کی پکار سنتا ہے جب وہ (ہر طرف سے مایوس ہو کر) اسے پکارنے لگتے ہیں اور ان کا درد دکھ ٹال دیتا ہے؟ اور وہ کہ اس نے تمہیں زمین کا جانشین بنایا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ (افسوس تمہاری غفلت پر) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو۔ اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جو صحراؤں اور سمندروں کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے وہ

کون ہے جو باران رحمت سے پہلے خوشخبری دینے
والی ہوائیں چلاتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی
دوسرا بھی معبود ہے؟ (ہرگز نہیں) اللہ کی
ذات اس ساجھے سے پاک و منزہ ہے جو
لوگ اس کی معبودیت میں ٹھہرا رہے ہیں۔
اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جو مخلوقات کی پیدائش
شروع کرتا ہے اور پھر اسے دہراتا ہے اور
وہ کون ہے جو آسمان و زمین کے کارخانۂ
رزق سے تمہیں روزی دے رہا ہے؟ کیا
اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟
(اے پیغمبر) ان سے کہو اگر تم (اپنے رویہ میں)
سچے ہو اور انسانی عقل و بصیرت کی اس
عالمگیر شہادت کے خلاف تمہارے پاس
کوئی دلیل ہے تو اپنی دلیل پیش کرو۔

ان سوالات میں سے ہر سوال اپنی جگہ ایک مستقل دلیل ہے کیونکہ ان
میں سے ہر سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ فطرتِ انسانی کا عالمگیر اور مسلّمہ
اذعان ہے۔ قرآن کے وہ بے شمار مقامات جن میں کائنات ہستی کے سر و سامان
پرورش اور انتظام ربوبیت کی کارسازیوں کا ذکر کیا گیا ہے دراصل قرآنی
استدلال کی بنیاد یہی ہے اور اسی سے توحید الہٰی کی تائید ہوتی ہے۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ○ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ○ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ○ فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ○ وَعِنَبًا وَقَضْبًا ○ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ○ وَحَدَائِقَ غُلْبًا ○ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ○ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ○

(۸۰: ۲۴: ۳۲)

انسان اپنی غذا پر نظر ڈالے (جو شب و روز اس کے استعمال میں آتی ہے) ہم پہلے زمین پر پانی برساتے ہیں پھر اس کی سطح شق کر دیتے ہیں پھر اس کی روئیدگی سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیتے ہیں۔ اناج کے دانے، انگور کی بیلیں کھجور کے خوشے، سبزی ترکاریاں، زیتون کا تیل درختوں کے جھنڈ، قسم قسم کے میوے طرح طرح کا چارہ اور یہ سب کچھ کس کے لئے؟ تمہارے فائدے کے لئے اور تمہارے جانوروں کے لئے

ان آیات میں "فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ" کے زور پر غور کرو۔ انسان کتنا ہی غافل ہو جائے اور حقائق زندگی سے کتنا ہی اعراض کرے لیکن دلائل حقیقت کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ وہ کسی حال میں بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتیں۔ ایک انسان دنیا کے تمام مظاہر کی طرف سے آنکھیں بند کر لے لیکن اپنی غذا کے ذرائع کی طرف سے بہرحال آنکھیں بند نہیں کر سکتا جو غذا اس کے سامنے رکھی ہے اس پر نظر ڈالے۔ یہ کیا ہے؟ گیہوں کا ایک دانہ! اچھا! گیہوں کا ایک دانہ اپنی ہتھیلی پر رکھ لو اور اس کے پیدائش سے لے کر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام مرحلوں پر غور کرو۔ کیا یہ حقیر سا دانہ بھی وجود میں آ سکتا تھا اگر تمام کارخانہ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ رہتا؟ اور اگر دنیا میں ایسا باقاعدہ نظام اشتراکیت موجود ہے تو کیا یہ ہو سکتا ہے

کہ کوئی اس کا ناظم اور کارفرما نہ ہو ؟

سورۂ نحل میں یہی استدلال ایک دوسرے پیرایہ میں نمودار ہوا ہے :-

وَاِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً ؕ نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِہٖ مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ ۝ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْہُ سَکَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

اور (دیکھو یہ) چارپائے (جنہیں تم پالتے ہو) ان میں تمہارے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کی کتنی بڑی عبرت ہے؟ ان کے جسم سے ہم خون و کثافت کے درمیان دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لئے بے غل و غش مشروب ہوتا ہے (اسی طرح) کھجور اور انگور کے پھل ہیں جن سے نشہ کا عرق اور اچھی غذا دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہو، بلاشبہ اس بات میں ارباب عقل کے لئے (ربوبیت الٰہی کی) بڑی نشانی ہے۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِہَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً

اور (پھر دیکھو) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس غرض کے لئے بلند کر دی جاتی ہیں اپنے لئے گھر بنائے پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے پھر اپنے پروردگار کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر کامل فرمانبرداری کے ساتھ گامزن ہو۔ (چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ) اس کے شکم سے مختلف

لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۶۹:۶۶:۱۶) | رنگتوں کا رس نکلتا ہے جس میں انسان کے لئے شفا ہے، بلاشبہ اس بات میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں ربوبیت الٰہی کی عجائب آفرینیوں کی بڑی نشانی ہے۔

جس طرح قرآن نے وجود خالق کے ثبوت میں جا بجا خلقت سے استدلال کیا ہے اسی طرح وہ نظامِ حیات اور تخلیقِ کائنات کے احوال سے ربوبیت کا بھی استدلال کرتا ہے یعنی دنیا میں ہر چیز مربوب ہے اس لئے ضروری ہے کہ کوئی رب بھی ہو۔ اور دنیا میں ربوبیت کامل اور بے داغ ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ رب کامل ہو اور بے داغ ہو۔

زیادہ واضح لفظوں میں اسے یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں دنیا میں ہر چیز ایسی ہے کہ اسے پرورش کی احتیاج ہے اور اس کی پرورش کے سامان مہیا ہیں پس ضروری ہے کہ کوئی پرورش کرنے والا بھی موجود ہو، یہ پرورش کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ یقیناً وہ نہیں ہو سکتا جو خود محتاج پرورش ہو، قرآن کی مندرجہ ذیل آیات اس استدلال پر مبنی ہیں:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ○ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ○ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ○ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ○	اچھا تم نے اس بات پر غور کیا کہ جو کچھ تم کشت کاری کرتے ہو اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے چورا چورا کر دیں اور تم صرف یہ کہنے کے لئے رہ جاؤ کہ افسوس! ہمیں تو اس نقصان کا تاوان

بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝
أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي
تَشْرَبُونَ ۝ أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ
مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ۝
لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا
فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝ أَفَرَأَيْتُمُ
النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝ أَأَنتُمْ
أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ
الْمُنشِئُونَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا
تَذْكِرَةً وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ ۝

(۵۶ : ۶۳ تا ۷۳)

ہی دیکھنا پڑے گا بلکہ ہم تو اپنی محنت کے سارے
فائدوں سے ہی محروم ہو گئے۔ اچھا تم نے
یہ بات بھی دیکھی کہ یہ پانی جو تمہارے پینے
میں آتا ہے اسے کون برساتا ہے!
اگر ہم چاہیں تو اسے سمندر کے پانی
کی طرح کڑوا کر دیں۔ پھر کیا اس نعمت کے
لئے ضروری نہیں کہ تم شکر گزار ہو؟ اچھا تم نے
یہ بات بھی دیکھی کہ یہ آگ جو تم سلگاتے
ہو تو اس کے لئے لکڑی تم نے پیدا کی یا ہم
پیدا کر رہے ہیں۔

ربوبیت۔ وجودِ معاد پر استدلال

اسی طرح وہ تخلیق بالحق سے معاد یا حیات بعد الممات پر بھی استدلال کرتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جس کی طرف پورا کاروانِ ہستی چلا جا رہا ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ انسان کو محض اس لئے بنایا گیا ہو کہ وہ چند روز زندہ رہے پھر سر تا سر نیست و نابود ہو جائے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ انسان جو کرہ ارضی کی بہترین مخلوق ہے اور جس کی جسمانی اور معنوی نشو و نما کے لئے فطرتِ کائنات نے اس قدر اہتمام کیا ہے وہ کوئی بہتر استعمال اور بلند تر مقصد نہ رکھتا ہو؟ خالقِ کائنات نے جب ہر چیز کو ایک خاص غرض و غایت کے لئے تخلیق کیا ہے تو

تو کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بہترین مربوب یعنی انسان کو محض اس لیے بنایا ہو کہ مہمل اور بے نتیجہ چھوڑ دے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۝ (۲۳: ۱۱۵: ۱۱۶)

کیا تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بغیر کسی مقصد و نتیجہ کے پیدا کیا ہے اور ہماری طرف لوٹنے والے نہیں؟ اللہ جو اس کائنات ہستی کا حقیقی حکمران ہے اس سے بہت بلند ہے کہ ایک بیکار و عبث فعل کرے کوئی معبود نہیں ہے مگر وہ جو (جہانداری کے) عرش بزرگ کا پروردگار ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۣ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝ (۳۰: ۸)

کیا ان لوگوں نے اپنے دل میں کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے محض بیکار و عبث نہیں بنایا ہے ضروری ہے کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہو اور اس کے لیے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہو۔ اصل یہ ہے کہ انسانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروردگار کی ملاقات سے یک قلم منکر ہیں

یہاں تک ہم نے یہ بات اسی سادہ طریقے پر بیان کر دی جو قرآن کے بیان و خطاب کا طریقہ ہے لیکن اس مطلب کو علمی بحث و گفتگو کے پیرائے میں یوں بیان

کیا جاسکتا ہے کہ وجود انسان کرۂ ارضی کے سلسلہ خلقت کی آخری اور اعلیٰ ترین کڑی ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ اگر پیدائش حیات سے لے کر انسانی وجود کی تکمیل تک کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایک ناقابل شمار مدت کے مسلسل نشوو ارتقاء کی تاریخ ہوگی، گویا فطرت نے لاکھوں کروڑوں برس کی کارفرمائی و صناعی سے کرۂ ارض پر جو اعلیٰ ترین وجود تیار کیا ہے وہ انسان ہے، ماضی کے لئے اس نقطۂ بعید کا تصور کرو، جب ہمارا یہ کرۂ سورج کے ملتہب کرہ سے الگ ہوا تھا نہیں معلوم کتنی مدت اس کے ٹھنڈے اور معتدل ہونے میں گزر گئی اور یہ اس قابل ہوا کہ زندگی کے عناصر اس میں نشوونما پاسکیں اس کے بعد وہ وقت آیا جب اس کی سطح پر نشوونما کی سب سے پہلی داغ بیل پڑی اور پھر نہیں معلوم کتنی مدت کے بعد زندگی کا وہ اولین تخم وجود میں آسکا جسے پروٹوپلازم (PROTOPLASM) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، پھر حیات عضوی کی نشوونما کا دور شروع ہوا اور نہیں معلوم کتنی مدت اس پر گزر گئی کہ اس دور نے بسیط سے مرکب تک اور ادنیٰ سے اعلیٰ درجے تک ترقی کی منزلیں طے کیں یہاں تک کہ حیوانات کی ابتدائی کڑیاں ظہور میں آئیں اور پھر لاکھوں برس اس میں نکل گئے کہ یہ سلسلہ وجود انسانی تک مرتفع ہوا پھر انسان کے۔ یانی ظہور کے بعد اس کے ذہنی ارتقاء کا سلسلہ شروع ہوا اور بالآخر ہزاروں برس کے اجتماعی اور ذہنی ارتقاء کے بعد وہ انسان ظہور پذیر ہو سکا جو کرۂ ارضی کے تاریخی عہد کا عقل اور متمدن انسان ہے گویا زمین کی پیدائش سے لے کر ترقی یافتہ انسان کی تکمیل تک جو کچھ گذر چکا ہے اور جو کچھ بنتا سنورتا رہا ہے وہ تمام تر انسان کی پیدائش و تکمیل ہی کی سرگذشت ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس وجود کی پیدائش کے لئے فطرت نے اس درجہ اہتمام کیا ہے کیا یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ وہ پیدا ہو، کھائے پئے اور مر کر فنا ہو جائے قدرتی طور پر اس سلسلہ میں ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر وجود انسانی اپنے ماضی میں ہمیشہ کے لئے یکے بعد دیگرے متغیر ہوتا اور ترقی کی اعلیٰ تر منزلوں پر پہنچتا رہا ہے تو مستقبل میں بھلا یہی ترقی و ارتقاء کیوں جاری نہ رہے؟

اگر اس بات پر ہمیں تعجب نہیں ہوتا کہ ماضی میں بے شمار صورتیں مٹیں اور کے بعد نئی زندگیاں ظہور میں آئیں تو اس بات پر کیوں تعجب ہو کہ انسان کی موجودہ زندگی کا مٹنا بھی بالکل مٹ جانا نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بھی ایک اعلیٰ تر شکل اور زندگی ہے۔

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی ؕ اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَۃً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰی ۙ ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ۙ (۷۵:۳۶)

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائے گا اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہ ہوگی کیا اس پر یہ حالت نہیں گذر چکی کہ پیدائش سے پہلے نطفہ تھا پھر نطفہ سے علقہ ہوا (یعنی جونک کی شکل ہو گئی) پھر علقہ سے (اس کا ڈیل ڈول) پیدا کیا گیا پھر (اس ڈیل ڈول کو) ٹھیک ٹھیک درست کیا گیا

لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ؕ (۸۴:۱۹)

کہ تم کو درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت پر پہنچنا ہے۔

ربوبیت ۔ وحی پر استدلال

اسی طرح قرآن نظام ربوبیت یا رحمت الٰہی کے اعمال سے نیکی اور بدی کے ان قوانین پر بھی استدلال کرتا ہے جو حیات انسانی میں کار فرما ہیں اور وحی و رسالت کی دلیل بھی پیش کرتا ہے مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ جس رب العالمین نے ہر چیز کی جسمانی نشو و نما کے لئے ایسا نظام قائم کر رکھا ہے کیونکر ممکن ہے کہ اس نے روحانی فلاح و سعادت کے لئے کوئی قانون قاعدہ مقرر نہ کیا ہو جس سے انسان کی روحانی ضرورتوں کی تکمیل ہو۔

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ (۴۵: ۱)

یہ اللہ کی طرف سے کتاب ہدایت نازل کی جاتی ہے جو عزیز اور حکیم ہے

قرآن بیشک ان لوگوں سے واقف ہے جو وحی الٰہی کے اصول پر شبہ کرتے ہیں

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۝ (۶: ۹۱)

اور اللہ کے کاموں کی انہیں جو قدر شناسی کرنی تھی یقیناً انہوں نے نہیں کیا جب انہوں نے یہ بات کہی کہ اللہ نے اپنے کسی بندے پر کوئی چیز نازل نہیں کی

اس کے لئے قرآن جسمانی دنیا کی تمثیل پیش کرتا ہے کہ جس طرح انسان کی جسمانی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ایک باقاعدہ نظام موجود ہے اسی طرح اس کی روحانی ہدایت کے لئے بھی سر و سامان مہیا کیا گیا ہے۔ ربوبیت الٰہی خدا کی تخلیقی سرگرمیوں کا ایک مظہر ہے جو اس کی صفت رحمت پر دلالت کرتا ہے جس کے بارے میں مولانا آزاد کے خیالات کو اگلے باب میں بیان کیا گیا ہے۔

باب سوم

صفتِ رحمت

پہلا حصہ :- رحمتِ الٰہی

ربوبیتِ الٰہی کا نظام، جس پر گذشتہ باب میں روشنی ڈالی گئی ہے زندگی کی ایک جاذبِ توجہ حقیقت ہے لیکن مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کائنات ہستی کے ہر گوشہ میں ربوبیت الٰہی سے بھی زیادہ وسیع حقیقت کارفرما ہے جس پر خود ربوبیت کا انحصار ہے۔ قرآن اسے رحمت یا رحمانیت یا رحیمیت سے تعبیر کرتا ہے۔ جو ہر مخلوق کو جمال و تکمیل عطا کرتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ط — اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ (۷ : ۱۵۵)

قرآن کی پہلی سورۃ یعنی سورۃ فاتحہ کی دوسری آیت میں رحمت کے تصور کو واضح طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ سورۃ فاتحہ کے سرِ عنوان "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ہی میں اس تصور کی نقش آرائی کر دی گئی ہے، اس میں "الرحمٰن" اور "الرحیم" کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں دونوں کا مادہ رحمت ہے عربی میں "رحمت" کے معنی ہیں ایسی رقت و نرمی جس سے کسی دوسرے کے لئے شفقت کا اظہار ہو، پس رحمت میں محبت، شفقت، فضل اور احسان

سب کا مفہوم واضح ہے "الرحمٰن" کے معنی ہیں جس میں رحمت ہے۔ اور "الرحیم" کا مفہوم ہے ایسی ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور ہوتا رہتا ہے یا ایسی ہستی جس سے کائنات خلقت کی ہر شے ہر لمحہ فیضیاب ہوتی رہتی ہے ان دونوں حیثیتوں کو ایک ساتھ واضح کرنے میں قرآن کا مقصد یہ ہے کہ رحمت الٰہی کی ہمہ گیری کو واضح کیا جائے ربوبیت کی نشان مخلوق کی پرورش ہے، لیکن صرف پرورش ہی زندگی کا منتہیٰ نہیں ہے اس پورے کارخانہ ہستی کی تخلیق بے معنی ہو کر رہ جاتی اگر اس کے ہر عمل میں بتدریج بناؤ اور سنوار کا خاصہ ہوتا، فلسفہ کہتا ہے کہ فطرت کا منشا اور مقتضیٰ یہ ہے کہ وہ بنائے سنوارے اور نکھارے۔ بناؤ کا مزاج اعتدال چاہتا ہے اور حسن تناسب کا متقاضی ہوتا ہے اور اعتدال وتناسب دنیا کے تمام تعمیری حقائق کی اصل ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کائنات میں صرف تعمیر کی ضرورت کیوں ہے؟ محض ہم آہنگی کیوں ہے انحراف ونچاوز کیوں نہیں؟ فلسفہ ان سوالات کا جواب نہ دے سکا، ایک مؤرخ اور فلسفی کا قول ہے کہ جس مقام سے "یہ کیوں" شروع ہوتا ہے فلسفہ کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن قرآن اس کا جواب دیتا ہے، وہ کہتا ہے یہ ضرورت رحمت الٰہی کی ضرورت ہے، رحمت الٰہی چاہتی ہے کہ جو کچھ ظہور میں آئے وہ جمیل وزیبا ہو اور اسی لئے ایسا ہوتا ہے، قرآن سوال کرتا ہے۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ قُلْ لِّلّٰهِ ۚ كَتَبَ عَلٰى	آسمان وزمین میں جو کچھ ہے وہ کس کے لئے ہے؟ (اے پیغمبر) کہدے کہ اللہ کے لئے

نفسہ الرحمۃ (۶ : ۱۲)

ہے جس نے اپنے لئے ضروری ٹھیرایا ہے کہ رحمت ہو

اس سلسلہ میں مولانا آزاد نے قرآن کی متعدد آیات پیش کی ہیں جن میں اس امر پہ زور دیا گیا ہے کہ کائناتِ ہستی کے ہر ذرہ میں حسن و خوبی ہے اور یہ تمام کارگاہ عالم اسی لئے بنا ہے کہ انسان کو اس سے فائدہ پہنچے اس آیت قرآنی میں اسی صداقت کو بیان کیا گیا ہے :۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵ : ۱۳)

اور آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے (یعنی انکی قوتیں اور تاثیریں اس طرح تمہارے تصرف میں دیدی گئی ہیں کہ جس طرح چاہو کام لے سکتے ہو) بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس بات میں (معرفت حق کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کائنات ہستی میں رحمت الہٰی کا یہ نظام کچھ اس طرح کارفرما ہے کہ بیک وقت ہر مخلوق کو یکساں طور پہ نفع پہنچاتا ہے اگر ایک عالیشان محل میں رہنے والا انسان یہ محسوس کر سکتا ہے کہ تمام کارخانہ ہستی اسی کی کاربرآریوں کے لئے ہے تو ٹھیک اسی طرح ایک چیونٹی بھی یہ کہہ سکتی ہے کہ فطرت کی ساری کارفرمائیاں صرف اسی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہیں۔ اور کون ہے جو اس بات سے انکار کر سکتا ہے؟ کیا فی الحقیقت سورج اس لئے نہیں ہے کہ چیونٹی کو حرارت پہنچائے، کیا بارش اس لئے نہیں ہے کہ اس کے

واسطے رطوبت مہیا کرے اور ہوا اس لئے نہیں ہے کہ اس کی ناک تک شکر کی بو پہنچائے؛ کیا زمین اس کے لئے ہر موسم کے مطابق مقام و پناہ گاہ فراہم نہیں کرتی؛ دراصل فطرت کی بخشائشوں کا قانون کچھ ایسا عام اور ہمہ گیر واقع ہوا ہے کہ بیک وقت ہر مخلوق کو یکساں طور پہ فائدہ پہنچاتا ہے:-

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ	اور زمین کے تمام جانور اور (پیدار) بازوؤں
وَلَا طَائِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ	سے اڑنے والے تمام پرند دراصل تمہاری ہی
اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (۶: ۳۸)	طرح امتیں ہیں۔

تخریب و تعمیر البتہ یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ دنیا عالم کون و فساد ہے۔ یہاں ہر بننے کے ساتھ بگڑنا ہے اور ہر بکھرنے کے ساتھ سمٹنا ہے جس طرح سنگ تراش کا پتھر کو توڑنا پھوڑنا اس لئے ہوتا ہے کہ خوبی و دلآویزی کا ایک پیکر تیار کر دے۔ اسی طرح کائنات عالم کا تمام بگاڑ بھی اسی لئے ہے کہ بناؤ اور خوبی کا فیضان ظہور میں آئے فطرت اسی نہج سے ہستی کی عمارت کا ایک، ایک گوشہ تیار کرتی رہتی ہے وہ پوری اعتنا و توجہ کے ساتھ اس کارخانہ کا ایک ایک پرزہ، ڈھالتی رہتی ہے اور حسن و خوبی کی حفاظت کے لئے ہر رکاوٹ کا مقابلہ اور ہر نقصان کا ازالہ کرتی رہتی ہے، تعمیر و تکمیل کی یہی سرگرمیاں ہیں جو بظاہر تخریب و تباہی کی ہولناکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ حالانکہ کارخانہ ہستی میں تخریب کہاں ہے جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے وہ تعمیر ہی کا ثبوت ہے۔ سمندروں میں طوفان۔ دریاؤں میں طغیانیاں، پہاڑوں میں آتش فشانی، جاڑوں میں

برفباری، گرمیوں میں بادِ سموم۔ بارش میں ہنگامۂ ابر و باد و برق و رعد یہ سب اگرچہ بظاہر خوش آئند نہیں ہوتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر حادثہ کائنات ہستی کی تعمیر و درستگی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جس قدر کوئی مفید سے مفید چیز تمہاری نظر میں ہو سکتی ہے، اگر سمندروں میں طوفان نہ اٹھتے تو میدانوں کو بارش کا ایک قطرہ بھی میسر نہ آتا۔ اگر بادلوں میں گرج کڑک نہ ہوتی تو بارانِ رحمت کا فیضان بھی نہ ہوتا اگر آتش فشاں پہاڑوں کی چوٹیاں نہ پھٹتیں تو زمین کے اندر کا کھولتا ہوا لاوا اس کرۂ ارض کی تمام سطح کو پارہ پارہ کر دیتا اور اس کے اوپر پھیل جاتا، تم پوچھ بیٹھو گے کہ زمین کے اندر یہ کھولتا ہوا لاوا پیدا ہی کیوں کیا گیا! لیکن تمہیں جاننا چاہیے کہ اگر یہ مادہ نہ ہوتا تو زمین کی قوتِ نشو و نما کا ضروری عنصر مفقود ہو جاتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی جانب قرآن نے جا بجا اشارے کیے ہیں۔ مثلاً قرآن کہتا ہے:۔

وَمِنْ آیٰتِهٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ

(۳۰ : ۲۴)

اور (دیکھو) اس کی (قدرت و حکمت کی) نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ بجلی کی چمک اور کڑک نمودار کرتا ہے اور اس سے تم پر خوف اور امید دونوں کی حالتیں طاری ہو جاتی ہیں اور آسمان سے پانی برساتا ہے اور پانی کی تاثیر سے زمین مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھتی ہے۔ بلاشبہ اس صورت



حال میں ان لوگوں کے لئے جو عقل و
بینش رکھتے ہیں حکمت الٰہی کی،
بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

جمالِ فطرت

قرآن کہتا ہے کہ فطرت کی سب سے بڑی بخشائش اس کا عالمگیر حسن و جمال ہے جو رحمت الٰہی کا عکس ہے، فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں بلکہ وہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ہے کہ اس کا ہر نقش نظر افروز ہوتا ہے، دراصل کائنات ہستی کا مایۂ خمیر ہی حسن و زیبائی ہے، فطرت نے جس طرح اس کے بناؤ کے لئے عناصر پیدا کئے اسی طرح چہرۂ وجود کی آرائش و زیبائش کے لئے روشنی، رنگ، خوشبو اور نغمہ کی تخلیق کی۔

ذَالِكَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۙ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ (۳۲: ۶، ۷)

یہ اللہ ہے، محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا، طاقت والا، رحمت والا، جس نے جو چیز بنائی حسن و خوبی کے ساتھ بنائی۔

بلاشبہ ہم کائناتِ ہستی میں خوبی و دلربائی کے پہلو بہ پہلو زشتی و بدصورتی کے مظاہر بھی پاتے ہیں، بلبل کی نغمہ سنجی کے ساتھ ساتھ زاغ و زغن کا شور و غوغا بھی ہم سنتے ہیں، ساز فطرت کے تاروں میں اتار چڑھاؤ کے تمام آہنگ موجود ہیں اور کائنات ہستی میں ہم آہنگی کا ہی قانون کارفرما ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ

ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی بھی ان میں ہے سب اپنی بناوٹ کی خوبی اور صفت

اِمّن شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَلٰکِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِیۡحَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ کَانَ حَلِیۡمًا غَفُوۡرًا ○ (۱۷: ۴۴)

کے کمال میں اللہ کی بڑائی اور پاکی کا زبان حال سے) اعتراف کر رہے ہیں اور اتنا ہی نہیں (بلکہ کائنات خلقت میں) کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو (زبان حال سے) اس کی تسبیح و تحمید نہ کر رہی ہو مگر (افسوس کہ) تم (اپنے جہل و غفلت سے) اس ترانہ تسبیح کو سمجھتے نہیں۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی بردبار (اور) بڑا ہی بخش دینے والا ہے۔

قرآن کہتا ہے حسن عبارت ہے تناسب و موزونیت ہے اور ہر وجود کو یہ خوبی عطا کی گئی ہے اور اس کی ساخت و ترکیب میں کوئی نقص نہیں ہے

فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ؕ (۲۳ : ۱۴)

پس کیا ہی بابرکت ذات ہے اللہ کی بنانے والوں میں سب سے زیادہ حسن و خوبی کے ساتھ بنانے والا۔

اَلَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ○ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ

اس نے تہ بہ تہ سات آسمان پیدا کئے تو (خدائے) رحمٰن کی اس صنعت میں کچھ نقص نہ دیکھے گا، پھر آنکھ اٹھا کر دیکھ بھلا تجھ کو (آسمان میں) کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ (اچھی طرح) دیکھ۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر بار نظر ناکام ہو کر اور تھک کر

حَسِيْرٌ ۵ (۶۷ : ۳ : ۴) تیرے پاس لوٹ کر آئے گی

اس آیت میں "خدا نے ان کی کاریگری" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں قرآن کہتا ہے کہ ہر چیز ایک ایسی ہستی کی پیدا کی ہوئی ہے جو صرف خالق نہیں بلکہ ساتھ ہی خدائے رحمت بھی ہے اور جہاں رحمت کی کارفرمائی ہوگی وہاں جمال و حُسن کی جلوہ گری بھی ہوگی۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ زندگی میں رحمت کی کارفرمائی نہ صرف یہ کہ توحید الٰہی کی شہادت ہے بلکہ وحی اور معاد کا بھی اس سے ثبوت ملتا ہے۔

زندگی کی ہماہمی

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کائنات ہستی میں جو سرگرمی اور ہماہمی نظر آتی ہے وہ بھی رحمتِ الٰہی کا ایک جلوہ ہے وہ کہتے ہیں کہ کائنات ہستی کے ہر میدان اور ہر گوشے میں جہدِ حیات کا بھی نظارا نظر آتا ہے اور زندگی بحیثیتِ مجموعی ایک آزمائش مسلسل ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۵ (۴ : ۹) بلاشبہ ہم نے انسان کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کی زندگی مشقتوں سے گھری ہوئی ہے

تاہم فطرت نے کارخانۂ معیشت کا ڈھنگ کچھ اس طرح کا بنا دیا ہے اور طبیعتوں میں کچھ اس طرح کے جذبے اور ولولے ودیعت کر دیے ہیں کہ انسان اپنے آپ کو پورے انہماک کے ساتھ کسی نہ کسی مشغولیت اور سرگرمی میں مصروف رکھتا ہے اور زندگی کا یہی انہماک ہے جس کی بدولت وہ نہ صرف زندگی کی مشقتیں برداشت کرتا ہے بلکہ انہیں مشقتوں سے اپنی راحت و مسرت کے سامان مہیا کر لیتا ہے، یہ مشقتیں جتنی زیادہ ہوتی ہیں، زندگی کی دلچسپی اور محبوبیت بھی اتنی

ہی بڑھ جاتی ہے اگر انسان کی زندگی ان آزمائشوں سے خالی ہو جائے تو وہ محسوس کرے گا کہ زندگی کی ساری لذتوں سے محروم ہو گیا ہے اور اب زندہ رہنا اس کے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے۔ مولانا آزاد نے مختلف النوع انسانی تجربات اور فطرت کے اختلاف و تنوع سے اس بات کا استشہاد کیا ہے، اس سلسلہ میں وہ بالخصوص قانون تزویج، یا اصول تثنیہ یعنی ہر چیز کے دو دو ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور اسے سرگرمی حیات کی معاون قوت قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کائنات ہستی میں کوئی چیز اکہری اور طاق نہیں پیدا کی گئی ہے، ہر چیز میں جفت اور دو ہونے کی قوت کام کر رہی ہے یعنی ہر چیز دوسری چیز سے مل کر مکمل ہوتی ہے۔ دن کے لئے رات ہے صبح کے لئے شام ہے نر کے لئے مادہ ہے، مرد کے لئے عورت ہے اور زندگی کے لئے موت ہے۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ٥ (٥١ : ٤٩)	اور ہر چیز میں ہم نے جوڑے پیدا کر دئے (یعنی دو دو اور متقابل اشیاء پیدا کیں) تاکہ تم یاد کرو
سُبْحٰنَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ٥ (٣٦ : ٣٦)	پاکی اور بزرگی ہے اس ذات کے لئے جس نے زمین کی پیداوار میں اور انسان میں اور ان تمام مخلوقات میں جن کا انسان کو علم نہیں دو دو اور متقابل چیزیں پیدا کیں۔

یہی قانونِ فطرت ہے جس نے مرد اور عورت میں جذب اور انجذاب کے ایسے وجدانی احساسات ودیعت کر دیئے ہیں کہ اس کی بدولت ازدواجی زندگی کے ضروری تقاضوں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ (۴۲ : ۱۱)

وہ آسمانوں اور زمین کا بنانیوالا اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس میں سے جوڑے بنا دیئے (یعنی مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد) اسی طرح چارپایوں میں بھی جوڑے پیدا کر دیئے

قرآن کہتا ہے یہ انتظام اس لئے ہے کہ محبت اور سکون ہو اور دو ہستیوں کی باہمی رفاقت و اشتراک سے زندگی کی محنتیں سہل اور گوارا ہو جائیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۰ : ۲۱)

اور (دیکھو) اس کی رحمت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کر دیئے (یعنی مرد کیلئے عورت اور عورت کیلئے مرد) تاکہ اس کی وجہ سے تمہیں سکون حاصل ہو اور پھر اسکی یہ کارسازی دیکھو کہ تمہارے درمیان (یعنی مرد اور عورت کے درمیان) محبت اور رحمت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ بلا شبہ ان لوگوں کیلئے جو غور و فکر کرنیوالے ہیں اس میں (حکمت الٰہی کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں

بقائے انفع مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کائنات ہستی کا یہ حسن اور یہ ارتقاء یاد رہے ایک قائم ہی نہیں رہ سکتا تھا اگر اس میں خوبی کی بقا اور خرابی کے ازالے کی قوت سرگرم کار نہ رہتی۔ فطرت ہمیشہ فساد و نقص کو محو کرتی رہتی ہے اور جس چیز دل میں اثبات خوبی ہوتی ہے انہیں باقی رکھتی ہے عام اصطلاح میں اسے "بقائے انفع" سے

تعبیر کیا جاتا ہے لیکن قرآن محض اشیاء کے مادی پہلو پر ہی نہیں بلکہ زندگی میں ان کی عام افادیت پر بھی زور دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کارگاہِ ہستی میں وہی چیز باقی رہتی ہے جس میں حیات کے لئے کچھ نہ کچھ افادہ و فیضان ہو۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِى النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ؕ (۱۷:۱۳)	خدا نے آسمان سے پانی برسایا تو ندی نالوں میں جسقدر سمائی تھی اسکے مطابق بہ نکلے جسقدر کوڑا کرکٹ جھاگ بن کر اوپر آگیا تھا، سیلاب اٹھا کر بہالے گیا اسی طرح جب زیور یا اور کسی طرح کا سامان بنانے کیلئے (مختلف قسم کی دھاتیں) آگ میں تپاتے ہیں تو اس میں بھی جھاگ اٹھتا ہے اور میل کچیل کٹ کر نکل جاتی ہے اسی طرح اللہ حق و باطل کی مثال بیان کر دیتا ہے جھاگ رائیگاں جائے گا (کیونکہ اس میں نفع نہ تھا) جس چیز میں انسان کے لئے نفع ہو گا وہ زمین میں باقی رہ جائے گی

قضا بالحق

قرآن کہتا ہے کہ جس طرح کائنات ہستی کے مادی نظام میں وہی چیز باقی رہتی ہے جو نافع ہوتی ہے ٹھیک یہی عمل معنویات میں بھی جاری ہے کہ وہی چیز باقی رہے گی جو نفع بخش ہو اس سلسلہ میں قرآن دو اصطلاحات استعمال کرتا ہے ,, حق ,, اور ,, باطل ,,

عربی میں حق کا مادہ ,, حقق ,, ہے جس کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے یعنی جو بات قائم رہنے والی اور واقع ہوا سے حق کہیں گے اور باطل ٹھیک اس کا نقیض ہے یعنی

ایسی چیز جس میں ثبات وقیام نہ ہو۔ پس جب کبھی حق اور باطل متقابل ہوں گے
تو جیت حق کے لئے ہوگی. قرآن اسے قضا بالحق سے تعبیر کرتا ہے۔

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط — اور کہدو حق نمودار ہو گیا اور باطل نابود ہوا
إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۱۷: ۸۳ — اور یقیناً باطل نابود ہونے والا تھا.

قرآن میں جہاں کہیں حق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو یہ صرف حق کے بقاء و ثبات کا دعویٰ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے جانچنے کا ایک معیار بھی پیش کرتا ہے تاکہ آسانی سے امتیاز پیدا کیا جا سکے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے کونسی چیز رہنے والی ہے اور کونسی چیز فنا ہونے والی ہے، چنانچہ وہ اللہ کی نسبت بھی "الحق" کی صفت استعمال ہوتا ہے اور وحی و تنزیل کو بھی الحق کہتا ہے۔

اگر فطرت کائنات زندگی کے لئے کار آمد اور بے کار چیزوں کو چھانٹتی نہ رہتی زندگی میں ایک انتشار برپا ہو جاتا اور تمام کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ — اور اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرے تو
السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ — یقین کرو یہ آسمان اور زمین اور جو کوئی
فِيهِنَّ (۲۳ : ۷۱) — اس میں ہے سب درہم برہم ہو کر رہ جائے

لیکن قضا بالحق کا یہ نتیجہ نہیں ہوتا کہ ہر باطل عمل یا وہ چیز جس میں زندگی کے لئے نفع نہیں ہے لازمی طور پر نابود ہو جائے یا ہر عمل حق فوراً فتحمند ہو جائے۔ ایسا عمل قانون رحمت کے مغایر ہوگا جس طرح مادیات میں تدریج و امہال کا قانون نافذ ہے. معنویات میں بھی وہی قانون کار فرما ہے تاکہ ہر نتیجہ کے ظہور اور عمل کے مکافات کے لئے مہلت مل سکے اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ دنیا میں کوئی انسانی جماعت

اپنی بدعملیوں کے ساتھ مہلت حیات پا سکتی۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ (۱۰:۱۲)

اور جس طرح انسان فائدہ کیلئے جلدباز ہوتا ہے اگر اسی طرح اللہ انسان کو سزا دینے میں جلد باز ہوتا تو (انسان کی لغزشوں خطاؤں کا یہ حال ہے کہ) کبھی کا فیصلہ ہو چکتا اور ان کا مقررہ وقت فوراً نمودار ہو جاتا

تدریج و امہال

فطرت کے یہ قوانین اس طرح اپنا کام کرتے ہیں کہ کسی حالت میں بھی فوری اور ڈرامائی انداز میں اچانک تبدیلی رونما نہیں ہوتی بلکہ بتدریج ان کی نشوونما ہوتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کیلئے ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے قرآن جہاں یہ بتاتا ہے کہ جو بھی (قانون حیات) ہم نے نافذ کر دیا ہے اس میں رد و بدل ممکن نہیں، وہیں یہ ارشاد بھی فرماتا ہے کہ "ہم اس بناء پر انسان کو کسی نامناسب عذاب میں مبتلا نہیں کرتے (۲۸:۵۱) فطرت نے ہر چیز کے تدریجی عروج و زوال کیلئے ایک خاص مدت مقرر کر دی ہے جس کا جلوہ صرف حیات انسانی ہی میں نہیں بلکہ ہر تخلیق میں دکھائی دیتا ہے۔ ہر چیز کے لئے ایک خاص وقت یا قرآن کی زبان میں، اجل، کا تعین کر دیا گیا ہے جو موجودات ہستی میں سے ہر موجود کے لئے الگ الگ نوعیت رکھتا ہے۔

تدریج و امہال کا یہ قانون خاص طور پر انسانی اعمال کے لئے ہے تاکہ ہر مرحلہ پر وہ توقف و تفکر سے کام لے اور قانون فطرت کی مہلت بخشیوں سے فائدہ اٹھائے چنانچہ توبہ و رجوع کے لئے رحمت کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے، قرآن کہتا ہے کہ کارخانہ

حیات بنیا اگر رحمت نہ ہوتی تو زندگی سے کوئی چیز بھی افادہ و فیضان حاصل نہ کر سکتی اور انسان اپنی بدعملیوں کے ساتھ کبھی زندگی کی سانس نہ لے سکتا۔

لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَل لَّهُم مَّوْعِدٌ لَّن يَجِدُوا مِن دُونِهِ مَوْئِلًا (۱۸ : ۵۸)

اگر وہ ان لوگوں سے ان کے اعمال کے مطابق مواخذہ کرتا تو فوراً عذاب نازل ہو جاتا لیکن ان کیلئے ایک میعاد مقرر کر دی گئی ہے اور جب وہ نمودار ہوگی تو اس سے بچنے کیلئے کوئی پناہ کی جگہ نہیں ملے گی

عمل حق اور عمل باطل دونوں کے لئے تدریج و امہال کا قانون کام کرتا ہے البتہ عمل حق کے لئے تاجیل اس واسطے ہوتی ہے کہ اس کی قوت کو تدریجی طور پر نشو و نما پانے کا موقع ملے اور باطل کے لئے اس واسطے ہوتی ہے کہ اسے توبہ و رجوع کی مہلت حاصل ہو سکے

كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (۱۷ : ۲۰)

(اے پیغمبر) ہم ان کو اور ان کو سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش سے مدد دیتے ہیں اور تمہارے پروردگار کی بخشش کسی پر بند نہیں ہے۔

نتائج اعمال

اگر انسان ان مہلت بخشیوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو وہ اپنے اعمال کی اصلاح کر سکتا ہے اور آگے بڑھ سکتا ہے اس کے برعکس اگر وہ ان مواقع سے فائدہ نہ اٹھائے تو پھر فیصلہ امر کا آخری وقت آجاتا ہے۔

فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (۱۶ : ۶۱)

سو جب ان کا وقت مقررہ آجاتا ہے تو اس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں نہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکتے ہیں

قرآن کہتا ہے کہ ہر عمل کے نتیجہ کے ظہور کے لئے ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت ٹھہرا دیا گیا۔

فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنتُكُمْ عَلَىٰ

پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو ان سے کہہ دیں

سَوَآءٍ ط وَاِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ہ

(۲۱ : ۱۰۹)

نے تم سب کو یکساں طور پر (حقیقت حال کی) خبر دیدی اور میں نہیں جانتا۔ اعمال بد کے نتائج کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے اس کا وقت قریب ہے یا ابھی دیر ہے۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ تم اپنے اوقات شماری کے پیمانے سے قوانین فطرت کی رفتار عمل کا اندازہ نہ لگاؤ۔ فطرت کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہے کہ تمہارے معیار حساب کی بڑی سی بڑی مدت اس کے لئے ایک دن کی مدت سے زیادہ نہیں۔

وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ ط وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ہ وَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اَمْلَیْتُ لَهَا وَهِیَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ط وَاِلَیَّ الْمَصِیْرُ ہ

(۲۲ : ۴۷ ۔ ۴۸)

اور یہ لوگ عذاب کیلئے جلد بازی کر رہے ہیں (یعنی انکار و شرارت کی راہ سے کہتے ہیں اگر سچ مچ عذاب آنیوالا ہے تو وہ کہاں ہے) سو یقین کرو خدا اپنے وعدہ میں کبھی خلاف کرنیوالا نہیں لیکن بات یہ ہے کہ تمہارے پروردگار کا ایک دن ایسا ہوتا ہے جیسے تمہارے حساب کا ہزار برس۔ چنانچہ کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں دعرصہ دراز تک) ڈھیل دی گئی حالانکہ وہ ظالم تھیں پھر جب ظہور نتائج کا وقت آگیا تو) ہمارا مواخذہ نمودار ہوگیا اور (ظاہر ہے کہ) لوٹ کر ہماری طرف آنا ہے

انسان عموماً اپنے اعمال کے فوری نتائج کا متوقع رہتا ہے۔ پیغمبر کے زمانے کے عرب جو ان کے مخالف و منکر تھے اکثر انہیں یہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ اگر وہ گمراہی میں مبتلا ہیں تو انہیں فوراً اس کی سزا ملنی چاہیے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جزائے عمل میں تاخیر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ توبہ و رجوع کی مہلت باقی رہے اور رحمت کا یہی قانون ہے جو اس کارخانہ ہستی میں جاری و ساری ہے۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ رَدِفَ لَكُم بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ۝ (۲۷ : ۷۱ : ۷۳)

اور (اے پیغمبر) یہ حقیقت فراموش (کہتے ہیں) اگر تم (نتائج ظلم وطغیان سے ڈرانے میں) سچے ہو تو وہ بات کب ہونیوالی ہے؟ (اور کیوں نہیں آچکتی؟) ان سے کہدو (گھبراؤ نہیں) جس بات کیلئے تم جلدی مچا رہے ہو عجب نہیں اس کا ایک حصہ بالکل قریب آگیا ہو اور (اے پیغمبر) تمہارا پروردگار انسانوں کیلئے بڑا ہی فضل رکھنے والا ہے (کہ ہر حال میں اصلاح و تلافی کی مہلت دیتا ہے) لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر) بیشتر ایسے ہیں کہ اس کے فضل و رحمت سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اس کی ناشکری کرتے ہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ ۚ وَلَوْلَا أَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاءَهُمُ الْعَذَابُ ط وَلَيَأْتِيَنَّهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝

(۲۹ : ۵۳)

اور یہ لوگ عذاب کی جلدی کرتے ہیں (یعنی انکار و شرارت کی راہ سے کہتے ہیں اگر واقعی عذاب آنیوالا ہے تو کیوں نہیں آچکتا؟) اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک خاص وقت نہ ٹھیرا دیا گیا ہوتا تو کب کا عذاب آچکا ہوتا اور (یقین رکھو جب وہ آئے گا تو اس طرح آئے گا کہ) یکایک ان پر آگریگا اور انہیں اس کا وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔

وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مَّعْدُودٍ ط

(۱۱ : ۱۰۴)

اور (یاد رکھو) اگر ہم اس معاملہ میں تاخیر کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ایک حساب کی ہوئی مدت کیلئے اسے تاخیر میں ڈالدیں۔

قابل غور بات یہ نہیں ہے کہ کسی عمل بد کے نتیجہ کے ظہور میں کتنی مدت لگتی ہے بلکہ قابل لحاظ امر یہ ہے کہ آخر کار کس قسم کے انسان برومند ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ آخر کار وہی انسان برومند ہوتے ہیں جو نیک عمل ہیں۔

قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ج فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لا مَنْ تَکُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ط اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ٥ (۶: ۱۳۷)

(اے پیغمبر) تم ان لوگوں سے کہدو کہ دیکھو اب میرے اور تمہارے معاملہ کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے، تم جو کچھ کرتے ہو اپنی جگہ کئے جاؤ اور میں بھی اپنی جگہ کام میں لگا ہوں، عنقریب معلوم ہو جائے گا کون ہے جس کے لئے آخر کار (کامیاب) ٹھکانہ ہے۔ بلاشبہ یہ اس کا قانون ہے کہ ظلم کرنے والا کبھی فلاح نہیں پا سکتے

قرآن نے اس اصول کی تبلیغ کی ہے کہ ہر قسم کے فسق و فجور کی ناکامی یقینی ہے اور نیک اور نیک عملی کا برومند ہونا لازمی ہے، قرآن نے جہاں جہاں اس اصول کا ذکر کیا ہے یا اس پر زور دیا ہے ان تمام مقامات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶: ۲۱)، اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۰: ۱۷)، لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ (۱۰: ۸۱) اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ (۹: ۳۸) اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۳: ۸۶) وغیرہ اس معینہ اصول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ارشاد و ہدایت کا دروازہ عمداً ان پر بند کر دیا جاتا ہے اور ان درجوں میں جو انسان آتے ہیں وہ گمراہی کی زندگی پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ قرآن کے مفسروں نے ان آیات کے مطالب اور قرآن کے اسلوب خاص کو سمجھنے میں غلطیاں کی ہیں قرآن کے ان ارشادات کا مطلب تو یہ ہے کہ اس

امر کے باوجود کہ کارخانۂ حیات میں قانونِ مواخذہ کارفرما ہے۔ رحمتِ الٰہی انسان کو اصلاحِ حال اور رجوع و انابت کی مہلتیں دیتی ہے لیکن جب ان مہلتوں کو بھی ٹھکرا دیا جاتا ہے یعنی جب گمراہی مسلط ہو جاتی ہے تو قانونِ مواخذہ اپنا عمل شروع کر دیتا ہے۔ ان مہلتوں سے فائدہ اٹھانے کو اصطلاحِ قرآنی میں "تمتع" کہا گیا ہے۔ یہی وہ تمتع ہے جو زندگی کی ہر حالت میں اور ہر انسان کو یکساں طور پر عطا ہوا ہے۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۔ (۲۱ : ۴۵)

بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو اور ان کے آباؤ اجداد کو مہلتِ حیات سے بہرہ مند ہونے کے مواقع دیئے یہاں تک کہ (خوشحالی کی) ان پر بڑی بڑی عمریں گذر گئیں۔

اسی طرح قرآن نے جا بجا مَتَّعْنَاہ اِلٰی حِیْنٍ (۱۰ : ۹۸) مَتَاعًا اِلَی حِیْنٍ (۳۶ : ۴۴)، فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۱۶ : ۵۵) وغیرہ تعبیرات سے اس حقیقت پر زور دیا ہے۔

قضا بالحق اور اقوام

جس طرح انسانی اعمال میں قضا بالحق یا بقا کا قانون کارفرما ہے اسی طرح قوموں یا جماعتوں کے معاملہ میں بھی اس قانون کی کارفرمائی موجود ہے اور وہ ان کے عروج و زوال کے حالات کا تعین کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ افراد کی طرح وہ قومیں اور جماعتیں بھی جو زندگی کے لئے غیر نافع ہوتی ہیں، چھانٹ دی جاتی ہیں، صرف وہی اقوام اور جماعتیں ہی باقی رہتی ہیں جو مقصدِ حیات کی ترقی اور نشو و نما کے لئے مفید ہوتی ہیں اور قانونِ رحمت یہی ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا میں انسانی ظلم و طغیان کے لئے کوئی روک تھام نہ رہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ

اور دیکھو، اگر اللہ نے جماعتوں اور قوموں میں

بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۲:۲۵۲)

باہمد گر تزاحم پیدا نہ کر دیا ہوتا اور وہ بعض آدمیوں کے ذریعہ بعض آدمیوں کو راستے سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً زمین میں خرابی پھیل جاتی لیکن اللہ کائنات کیلئے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر یہی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ (۲۲ : ۴۰)

اور اگر ایسا نہ ہوتا کہ اللہ بعض جماعتوں کے ذریعہ بعض جماعتوں کو ہٹاتا رہتا تو یقین کرو دنیا میں انسان کے ظلم و فساد کے لئے کوئی روک باقی نہ رہتی اور یہ تمام خانقاہیں گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اس کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے منہدم ہو کر رہ جاتیں۔

تدریج و امہال اجتماعی زندگی میں

جس طرح فطرت کائنات کے تمام کاموں میں تدریج و امہال کا قانون کارفرما ہے اسی طرح قوموں اور جماعتوں میں بھی اس قانون کی کارفرمائی موجود ہے۔ اصلاحِ حال اور رجوع و انابت کا دروازہ ان کے لئے بھی ہمیشہ کھلا رہتا ہے کیونکہ قانونِ رحمت کا مقتضیٰ یہی ہے

وَقَطَّعْنٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا مِّنْھُمُ

اور ہم نے ایسا کیا کہ ان کے الگ الگ گروہ زمین

الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ (۷ : ۱۶۸)

میں پھیل گئے ان میں سے بعض تو نیک عمل تھے بعض دوسری طرح کے پھر ہم نے انہیں اچھائیوں اور برائیوں دونوں طرح کی حالتوں سے آزمایا تاکہ نافرمانی سے باز آجائیں

جس طرح افراد کے لئے راہ راست پر لوٹنے کی ایک خاص مدت معین کر دی ہے اسی طرح اقوام کے لئے بھی اگر وہ راہِ راست سے بھٹک گئی ہوں تو سیدھے رستے پر واپس آنے کے لئے ایک مدت مقرر کر دی ہے۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ (۹ : ۱۲۶)

یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ان پر کوئی برس ایسا نہیں گزرتا کہ ہم انہیں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ آزمائشوں میں نہ ڈالتے ہوں (یعنی ان کے اعمال بد کے نتائج پیش نہ آتے ہوں) پھر بھی نہ تو توبہ کرتے ہیں نہ حالات سے نصیحت پکڑتے ہیں۔

ان تمام مہلتوں کو اگر رائیگاں کر دیا جائے تو پھر قانون فطرت کے فیصلہ امر کا آخری وقت نمودار ہو جاتا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۷ : ۳۴)

اور (دیکھو) ہر امت کیلئے ایک مقررہ وقت ہے سو جب ان کا مقررہ وقت آ چکتا ہے تو اس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں نہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکتے ہیں

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتٰبٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ

اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانون کے مطابق ایک مقررہ میعاد

أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُوْنَ ○

(۱۵ : ۴ : ۵)

اس کیلئے موجود تھی کوئی امت نہ تو اپنے مقررہ وقت سے آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے.

چنانچہ قضا بالحق کا یہی قانون ناپسندیدہ اور غیر نافع افراد کو چھانٹ دیتا ہے اور ان کی جگہ مقصد حیات کی تکمیل کے لئے دوسروں کو لا کھڑا کرتا ہے.

ذَالِكَ أَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ
الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَّأَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ○
وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَ
مَا رَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ○ إِنْ
يَّشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ م
بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِّنْ
ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِيْنَ

(۶ : ۱۳۱ : ۱۳۳)

یہ (تبلیغ و ہدایت کا تمام سلسلہ) اس لئے کہ تمہارے پروردگار کا یہ شیوہ نہیں کہ بستیوں کو ظلم و ستم سے ہلاک کر ڈالے اور بسنے والے حقیقت حال سے بیخبر ہوں (اس کا قانون تو یہ ہے) کہ جیسا جس کا عمل ہے اسی کے مطابق اس کا ایک درجہ ہے (اور اسی درجہ کے مطابق اچھے برے نتائج ظاہر ہوتے ہیں) اور یاد رکھو جیسے کچھ کسی کے اعمال ہیں تمہارا پروردگار ان سے بے خبر نہیں ہے، تمہارا پروردگار رحمت والا بے نیاز ہے اگر وہ چاہے تو تمہیں راہ سے ہٹا دے اور تمہارے بعد جسے چاہے تمہارا جانشین بنا دے اسی طرح جس طرح ایک دوسری قوم کی نسل سے تمہیں اوروں کا جانشین بنایا ہے

اصلاح حال اور رجوع و انابت کی مہلت بخشی کے سلسلہ میں مولانا آزاد نے رحمت الٰہی کی حیرت انگیز کارفرمائیوں کا ذکر کیا ہے، یہ ٹھیک ہے کہ قرآن نے ہر عمل کی جزا و سزا ابھار دیا ہے لیکن ساتھ ہی قرآن کا یہ ارشاد بھی ہے کہ قانون اصلاح و رجوع کے دروازے بند نہیں کرتا۔ توبہ و اصلاح کی مہلتوں پر مہلتیں دی گئی ہیں، جوں ہی توبہ و انابت کا احساس انسان کے اندر جنبش میں آتا ہے رحمت الٰہی معاً قبولیت کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

ہے اور اشکِ ندامت کا ایک ایک قطرہ بد عملیوں اور گناہوں کے بے شمار داغ دھبے اس طرح دھو دیتا ہے کہ گویا اس کے دامنِ عمل پر کوئی دھبہ لگا ہی نہ تھا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ۔ گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کے مانند ہو جاتا ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ قرآن کہتا ہے

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۲۵ : ۷۰)

ہاں مگر جس کسی نے توبہ کی ایمان لایا اور اس کے لئے نیک عملی اختیار کی تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ اچھائیوں سے بدل دیتا ہے اور بڑا بخشنے والا بڑا رحم کرنے والا ہے۔

قرآن کریم نے رحمتِ الٰہی کی وسعت اور اس کی مغفرت و بخشش کی فراوانی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ کتنے ہی سخت گناہ ہوں کیسی شدید ان کی نوعیت ہو اور کتنی ہی کثرت کے گناہ ہوں لیکن ہر اس انسان کے لئے جو اپنے گناہوں پر نادم ہو اور خلوص کے ساتھ اس کے دروازۂ رحمت پر دستک دے رحمت و قبولیت اسے اپنے آغوش میں لے لے گی۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (۳۹ : ۵۳)

اے میرے بندو جنہوں نے بدعملیاں کر کے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے تمہاری بدعملیاں کتنی ہی سخت اور کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں مگر اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو یقیناً اللہ تمہارے تمام گناہ بخش دے گا یقیناً وہ بڑا بخشنے والا بڑی ہی رحمت رکھنے والا ہے

حصۂ دُوم

صفتِ رحمت اور انسان

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے صفاتِ الٰہی میں عموماً اس کی صفت رحمت کی طرف کیوں اس طرح توجہ مبذول ؟؟ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ رحمت کی صفت خدا کی وہ صفت ہے جو اس کی تمام صفات پر حاوی ہے اور ہر ایک میں اس کا پرتو پایا جاتا ہے۔ اس کا جواب پیغمبر نے ایک حدیث قدسی میں یوں دیا ہے کہ:-

تم اپنے اندر صفاتِ الٰہی پیدا کرو

اور چونکہ رحمت ایک عالمگیر صفتِ الٰہی ہے اس لئے انسان کی اولین غایت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے فکر و عمل کے ہر شعبہ میں چاہے وہ سماجی ہو یا معاشی ہو یا سیاسی، اس صفت کی جھلک پیدا کرے۔

خدا اور بندے کے درمیان رشتۂ محبت

قرآن نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۖ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

اور دیکھو انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے ہیں جو دوسری ہستیوں کو اللہ کا ہم پلہ بنا لیتے ہیں وہ انہیں اس طرح چاہنے لگتے ہیں

اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط (۲: ۱۶۵)

جس طرح اللہ کو چاہنا ہوتا ہے حالانکہ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ محبت صرف اللہ ہی کے لئے ہوتی ہے

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ الرَّحِیْمٌ ۵ (۳: ۳۱)

(اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہہ دو اگر واقعی تم اللہ سے محبت رکھنے والے ہو تو چاہیے کہ میری پیروی کرو (میں تمہیں محبتِ الٰہی کی راہ دکھا رہا ہوں) اگر تم نے ایسا کیا تو صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اللہ سے محبت کرنے والے ہو جاؤ گے بلکہ خود اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے۔

قرآن جا بجا اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ ایمان باللہ کا نتیجہ اللہ کی محبت ہے:

یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّہُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ (۵: ۵۹)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین کی راہ سے پھر جائے گا تو (وہ یہ نہ سمجھے کہ دعوتِ حق کو اس سے کچھ نقصان پہنچے گا) عنقریب اللہ ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا کر دے گا جنہیں اللہ کی محبت حاصل ہوگی اور وہ اللہ کو محبوب رکھنے والے ہوں گے۔

قرآن کہتا ہے محبتِ الٰہی کی راہ اس کی مخلوق کی محبت میں سے ہو کر گذرتی ہے جو انسان چاہتا ہے کہ خدا سے محبت کرے اسے چاہیے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے

وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ
(٢: ١٧٧)

اور جو اپنا مال اللہ کی محبت میں نکالتے اور خرچ کرتے ہیں۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ○ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ○
(٧٦: ٨: ٩)

اور اللہ کی محبت میں وہ مسکینوں، یتیموں، قیدیوں کو کھلاتے ہیں، اور کہتے ہیں، ہمارا یہ کھلانا اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ محض اللہ کے لئے ہے ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ کسی طرح کی شکرگذاری۔

ایک حدیث قدسی میں یہی حقیقت نہایت مؤثر پیرایہ میں بیان کی گئی ہے

ان اللہ تعالیٰ یقول یوم القیامۃ یا ابن آدم مرضت فلم تعدنی قال یا رب کیف اعودک وانت رب العالمین قال اما علمت ان عبدی فلانا مرض فلم تعدہ اما علمت انک لو عدتہ لوجدتنی عندہ یا ابن آدم استطعمتک فلم تطعمنی قال یا رب وکیف اطعمک وانت رب العالمین قال اما علمت انہ استطعمک عبدی فلان فلم تطعمہ اما علمت انک

قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ خدا ایک انسان سے کہے گا، اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ متعجب ہو کر کہے گا بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے اور تو تو رب العالمین ہے، خدا فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہو گیا تھا اور تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی، اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لئے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، اسی طرح خدا فرمائے گا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی

لَوْ اَطْعَمْتَهٗ لَوَجَدْتَ ذٰلِكَ عِنْدِیْ يَا ابْنَ اٰدَمَ اسْتَسْقَيْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِیْ قَالَ يَا رَبِّ وَكَيْفَ اَسْقِيْكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ قَالَ اسْتَسْقَاكَ عَبْدِیْ فُلَانٌ فَلَمْ تَسْقِهٖ اَمَا اِنَّكَ لَوْ سَقَيْتَهٗ لَوَجَدْتَ ذٰلِكَ عِنْدِیْ ۔

(اخرجه مسلم عن ابی هريرة)

احتیاج ہو؟ خدا فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کر دیا تھا اگر تو اسے کھلاتا تو تو اسے میرے پاس پاتا۔ ایسے ہی خدا فرمائے گا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ بندہ عرض کریگا بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے تو تو خود پروردگار ہے۔ خدا فرمائے گا میرے فلاں پیاسے بندے نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے اسے پانی نہ پلایا۔ اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

اعمال وعبادات

اسی طرح قرآن نے اعمال وعبادات کی جو شکل ونوعیت قرار دی ہے، اخلاق وخصائل میں سے جن جن باتوں پر زور دیا ہے اور اوامر ونواہی میں جو جو اصول ومبادی ملحوظ رکھے ہیں ان سب میں بھی یہی حقیقت کام کر رہی ہے۔ قرآن نے خدا کی کسی صفت کو بھی اس کثرت کے ساتھ نہیں دہرایا ہے اور نہ کوئی مطلب اس درجہ اس کے صفحات میں نمایاں ہے جس قدر رحمت کا ذکر ہے۔ اگر قرآن کے وہ تمام مقامات جمع کئے جائیں جہاں رحمت کا ذکر کیا گیا ہے تو ایسے مقامات تین سو سے زیادہ ہوں گے۔ نیز اگر وہ تمام مقامات بھی شامل کر لئے جائیں جہاں اگرچہ لفظ رحمت استعمال نہیں ہوا ہے لیکن ان کا تعلق رحمت ہی سے ہے جیسے ربوبیت، مغفرت

رافت، کرم، حلم، عفو وغیرہ، تو پھر یہ تعداد اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ کہا جاسکتا ہے قرآن اول سے لے کر آخر تک اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمت الٰہی کا پیغام ہے پیغمبر اسلام نے اپنے قول و عمل سے جو حقیقت ہم پر واضح کی ہے وتمام تبلیغ ہے کہ خدا کی موحدانہ پرستش اور اس کے بندوں پر شفقت و رحمت کی جائے ایک مشہور حدیث ہمیں بتلاتی ہے کہ :-

اِنَّمَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مِنْ عِبَادِہِ الرُّحَمَاءُ — خدا کی رحمت انہیں بندوں کے لئے ہے جو اس کے بندوں کے لئے رحمت رکھتے ہیں

حضرت مسیح علیہ السلام کا مشہور کلمۂ وعظ کہ "زمین پر رحم کرو تاکہ جو آسمان پہ ہے تم پر رحم کرے"، بجنسہٖ پیغمبر اسلام کی زبان پر بھی طاری ہوا۔

اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ" ایک سے زیادہ حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ اللہ کی رحمت رحم کرنے والوں کے لئے ہے، اگرچہ یہ رحم ایک حقیر چڑیا ہی کے لئے کیوں نہ ہو۔

اصل یہ ہے کہ قرآن نے خدا پرستی کی بنیاد ہی اس جذبہ پر رکھی ہے کہ انسان اپنے قول و عمل میں خدا کی صفتوں کا پرتو پیدا کرے، وہ انسان کے وجود کو ایک ایسی سرحد قرار دیتا ہے جہاں حیوانیت کا درجہ ختم ہوتا اور ایک مافوق حیوانیت کا درجہ شروع ہو جاتا ہے۔ انسان کا جوہر انسانیت جو اسے حیوانیت کی سطح بلند و ممتاز کرتا ہے اور جو اسے اشرف المخلوقات کے مرتبہ تک پہنچاتا ہے۔ قرآن اسے خدا کی روح پھونک دینے سے تعبیر کرتا ہے۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ — یعنی خدا نے آدم میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ؕ (۳۲ : ۸)

دیا اور اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے اندر عقل و حواس کا چراغ روشن ہو گیا۔

اوپر کی آیت سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ کائناتِ ہستی میں انسان کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ خدا نے خود اپنی روح اس میں پھونک دی، یعنی انسان کو عقل و حواس کی زندگی میں رحمت کی کار فرمائی کے لئے یہ جوہر ودیعت کیا گیا۔

پس قرآن جہاں جہاں خدا کی رحمت کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا کرنا چاہتا ہے تو یہ اس لئے ہے کہ وہ چاہتا ہے ہم بھی اپنے اندر رحمت و ربوبیت کی ساری کیفیت پیدا کر لیں، خدا کی دوسری صفات کو پیش کرنے کا مدعا بھی یہی ہے جس بات پر قرآن سب سے زیادہ زور دیتا ہے وہ بخشش اور درگذر ہے قرآن کی تعلیم اس کا اصل اصول ہے، بلاشبہ اس نے یہ نہیں کہا کہ اپنے دشمنوں سے بھی پیار کرو لیکن اس نے یہ ضرور کہا کہ دشمنوں کو بھی بخش دو۔ جو دشمن کو بخش دینا سیکھ جائے گا وہ خود بھی خدا کی بخشش کا مستحق ہو جائے گا، اپنے نفس کو آلودگیوں سے پاک صاف کرنے کا طریقہ یہی ہے۔

اَلْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۚ (۳ : ۱۳۴)

غصہ ضبط کرنے والے اور انسانوں کے قصور بخش دینے والے اور اللہ کی محبت انہیں کیلئے ہے جو احسان کرنے والے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً

اور جن لوگوں نے اللہ کی محبت میں ہر تلخی و ناگواری برداشت کرلی، نماز قائم کی، خدا کی دی ہوئی روزی پوشیدہ و علانیہ اس کے بندوں کے لئے خرچ کی

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۙ (۱۳ : ۲۲)

اور برائی کا جواب برائی سے نہیں نیکی سے دیا کریں (یقین کرو) یہی لوگ ہیں جن کیلئے آخرت کا بہتر ٹھکانا ہے

قرآن نے بدلہ لینے سے بالکل روک نہیں دیا ہے لیکن جہاں کہیں بھی اس نے اس کی اجازت دی ہے صرف تحفظ حیات کے لئے دی ہے اور پھر یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ جہاں کہیں وہ انتقام کی اجازت دیتا ہے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ عفو و بخشش کی بہتر طریقہ ہے اور بدی کے بدلے میں نیکی کرنا تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ
مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ
لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝
(۱۶ : ۱۲۶)

اور (دیکھو) اگر تم بدلہ لو تو چاہیئے کہ (اتنی ہی اور) ویسی ہی کچھ برائی تمہارے ساتھ کی گئی ہے اسی کے مطابق ٹھیک ٹھیک بدلہ بھی لیا جائے (ایسا نہ ہو کہ زیادتی کر بیٹھو) لیکن اگر تم برداشت کر جاؤ اور بدلہ نہ لو (یاد رکھو) برداشت کرنے والوں کیلئے برداشت کر جانے ہی میں بہتری ہے

وَجَزٰۗؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ
فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى
اللّٰهِ ۭ (۴۲ : ۴۰)

اور برائی کے لئے ویسا ہی اور اتنا ہی بدلہ ہے جیسی اور جتنی برائی کی گئی ہے لیکن جس کسی نے درگذر کیا اور معاملہ کو بگاڑنے کی جگہ سنوار دیا تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔

انجیل اور قرآن ہم نے ابھی یہ بیان کیا ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ "اپنے دشمنوں سے بھی پیار کرو" یہ بیان کچھ اور تشریح چاہتا ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کی ظاہر پرستیوں اور اخلاقی محرومیوں کی جگہ رحم

و محبت اور عفو و بخشش کی اخلاقی قربانیوں پر زور دیا تھا چنانچہ ہم انجیل کے مواعظ میں جابجا اس طرح کے خطابات پاتے ہیں، "تم نے سنا ہوگا کہ اگلوں سے کہا گیا کہ دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ، لیکن میں کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا لیکن اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو چاہیئے دوسرا گال بھی آگے کر دو" "تم نے سنا ہوگا کہ اگلوں سے کہا گیا کہ اپنے ہمسایوں سے پیار کرو اور اپنے دشمن سے نفرت لیکن میں کہتا ہوں اپنے ہمسایوں سے پیار کرو اور جو تم پر لعنت بھیجتے ہیں ان پر رحمت بھیجو اور جو تم سے نفرت کرتے ہیں ان سے نیکی کرو اور ان کے لیے دعائے مغفرت کرو جو تمہارے ساتھ بیرحمی سے پیش آتے ہیں اور تمہیں ہلاک کرتے ہیں۔"

لیکن سوال یہ ہے کہ ان خطابات کی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ روحانی فضائل و اخلاق کا پیام تھا یا تشریع یعنی قوانین وضع کرنا تھا؟

دعوت مسیح کی فراموشی

مولانا آزاد اس امر پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ انجیل کے پیرو اور اس کے نکتہ چین دونوں یہاں مختلف قسم کی غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے اور مسیح علیہ السلام کے ان خطاب کو ایک قطعی ضابطۂ اخلاق سمجھ بیٹھے تاہم آخر کار انہیں یہ تسلیم کرنا کہ ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا اس کے باوجود پیروانِ مسیح نے اپنے آپ کو اس بات سے تسلی دے لی کہ اگرچہ یہ احکام ناقابل عمل ہیں لیکن چند مسیحوں ولیوں اور شہیدوں نے بہر حال ان پر عمل کر لیا تھا۔ دوسری طرف نکتہ چینوں نے کہا کہ یہ سر تا سر ایک تنظری اور ناقابل عمل تعلیم ہے عملی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور یہ فطرت انسانی کے صریح منافی ہے در حقیقت نوعِ انسانی کی یہ بڑی ہی درد انگیز ناانصافی ہے جو تاریخ انسانیت کے

اس عظیم الشان معلم کے ساتھ جائز رکھی گئی، جس طرح بیدرد نکتہ چینیوں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی اسی طرح نادان معتقدوں نے بھی فہم و بصیرت سے انکار کر دیا کیا مسیحؑ کا پیام واقعی ناقابل عمل تھا؟ کیا وہ فطرتِ انسانی کے مغائر تھا؟ ایسا تسلیم کر لینے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم بنیادی طور پر اس قرآنی تعلیم کو ضرب لگا رہے ہیں کہ دنیا کے تمام پیغمبروں کا پیام ایک ہی ہے۔

دعوتِ مسیح کی حقیقت

اصل یہ ہے کہ پیروانِ مسیحؑ نے تعلیمات مسیحؑ کی حقیقت کو سمجھنے میں کوتاہی کی۔ حضرت مسیحؑ کا ظہور تاریخ کے ایک ایسے عہد میں ہوا تھا جبکہ یہودیوں کا اخلاقی تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا اور دل کی نیکی اور اخلاق کی پاکیزگی کے بجائے محض ظاہری احکام و رسوم کی پرستش، دینداری و خدا پرستی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے علاوہ جتنی متمدن اقوام قرب و جوار میں موجود تھیں مثلاً رومی، مصری، آشوری، وہ بھی کم بیش اسی حالتِ زوال سے گزر رہی تھیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگوں نے یہ نہیں جانا کہ مسیحؑ کا پیام رافت و محبت اور عفو و بخشش اور جرم گناہ کی مروجہ زندگی سے باز رکھنے کے لئے تھا۔ اس زمانے میں انسانی قتل و ہلاکت کا تماشا دیکھنا طرح طرح کے ہولناک طریقوں سے مجرموں کو ہلاک کرنا، زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا، آباد شہروں کو بلاوجہ جلا کر خاکستر بنا دینا، اپنی قوم کے علاوہ تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا، رحم و محبت اور حلم و شفقت کی جگہ قلبی قساوت اور بے رحمی پر فخر کرنا، رومی تمدن کا اخلاق اور مصری اور آشوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا، ضرورت تھی کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے ایک ایسی ہستی مبعوث ہو جو سرتاسر رحمت و محبت کا پیام ہو اور انسان کی قلبی و معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی توجہ مبذول کر دے

چنانچہ حضرت مسیحؑ کی شخصیت میں وہ ہستی نمودار ہوئی، جس نے جسم کی جگہ روح پر زبان کی جگہ دل پر اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوعِ انسانی کو توجہ دلائی اور محبت و انسانیت کا فراموش شدہ سبق تازہ کر دیا۔

حضرت مسیحؑ کا الہامی کلام مجازات کی قدرتی تاثیر کا حامل تھا لیکن اقانیم ثلاثہ اور کفارہ جیسے دور از کار عقائد پیدا کرنے والے ان کے مواعظ کا مقصد و محل اور ان کے مجازات کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے اور ان کی سرتاسر لفظی تاویلات میں پڑ کر گمراہ ہو گئے۔

حضرت مسیحؑ نے جہاں کہیں یہ کہا ہے کہ اپنے دشمن سے پیار کرو، تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ہر انسان کو چاہیے کہ اپنے دشمنوں کا عاشقِ زار ہو جائے بلکہ اس کا سیدھا سادھا مطلب یہ تھا کہ تم میں غیض و غضب اور نفرت و انتقام کی جگہ رحمت و محبت کا پر جوش جذبہ ہونا چاہیے۔ ایسے گردوپیش میں جہاں اپنوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی نفرت کا برتاؤ کیا جاتا ہو یہ کہنا کہ اپنے دشمنوں سے پیار کرو، یقیناً نفرت و غضب سے کنارہ کش ہونے کا ایک کامل ترین جذبہ پیدا کر سکتا تھا۔ مثلاً اگر انہوں نے کہا تھا، اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دو، تو یقیناً مسیحؑ کے ذہن میں اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ سچ مچ تم اپنا دوسرا گال آگے کر دیا کرو بلکہ صریح مطلب یہ تھا کہ اپنے اندر عفو و درگزر کا جذبہ پیدا کرو۔ ہر بلیغ کلام کے لفظی معنی لینا شائستہ ذہن کا مظہر نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم اس طرح کے مجازات کو ان کے ظواہر پر محمول کرنے لگیں تو نہ صرف تمام الٰہی تعلیمات ہی درہم و برہم ہو جائیں گی بلکہ انسان کا وہ تمام کلام جو الہام و بلاغت کا مرقع ہے یک قلم مختل ہو جائے گا۔

بلاشبہ مذاہب وقوانین نے جرم وگناہ کے لیے تعزیر وعقوبت کا حکم دیا ہے کیونکہ انسانی معیشت کے لیے یہ ناگزیر ہے لیکن تعزیر وعقوبت کا مدعا صرف یہ ہوتا ہے یا صرف اس لیے اسے گوارا کیا جاتا ہے کہ بڑے درجہ کی برائیوں کو روکنے کے لیے ایک کم درجہ کی برائی کو برداشت کر لیا جائے۔ خالص مذہبی نقطۂ نظر سے تعزیر وعقوبت کی غایت اس سے زیادہ نہیں لیکن دنیا نے اسے انسان کی تعذیب وہلاکت کا خوفناک آلہ بنا لیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی قتل وغارتگری کی کوئی ہولناکی ایسی نہیں ہے جو شریعت اور قانون کے نام سے نہ کی گئی ہو۔ اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ جنگ وجدال کو چھوڑ کر انسانی ہلاکت وبربادی کی سب سے بڑی قوتیں کون کون سی رہی ہیں تو یقیناً اس کی انگلیاں ان عدالت گاہوں کی طرف اٹھ جائیں گی جو مذہب اور قانون کے نام سے قائم کی گئیں اور جنہوں نے ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کی تعذیب وہلاکت کا عمل جاری رکھا، حضرت مسیح کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ وہ نفس تعزیر وسزا کے خلاف کوئی نئی تشریع کریں بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ انسان میں عفو ومحبت کے جذبات کو موجزن کر دیں۔ بتلانا چاہتے تھے کہ اعمال انسانی میں اصل رحم ومحبت ہے اور عقوبت وانتقام ایک آخری شکل اور ایک ناگزیر علاج ہے۔

شریعت موسوی کے پیرؤں نے شریعت کو صرف سزا دینے کا آلہ بنا لیا تھا حضرت مسیح نے بتلایا کہ شریعت سزا دینے کے لیے نہیں بلکہ نجات کی راہ دکھانے آتی ہے اور نجات کی راہ سرتاسر رحمت ومحبت کی راہ ہے۔

عمل اور عامل

دراصل اس بارے میں انسان کی بنیادی غلطی یہ رہی ہے کہ وہ "عمل" اور "عامل" میں امتیاز قائم نہیں رکھتا، مذہب اس فرق

وامتیاز کو واضح طور پر پیش کرتا ہے، تمام مذاہب کا یہ مقصد رہا ہے کہ بدعملی اور گناہ کے عمل کی طرف سے انسان کے دل میں نفرت پیدا کی جائے لیکن یہ انہوں نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ خود انسان کی طرف سے انسان کے اندر نفرت پیدا ہو جائے یقیناً انہوں نے زور دیا ہے کہ گناہ سے نفرت کرو لیکن یہ کبھی نہیں کہا ہے کہ گنہگار سے نفرت کرو۔ لیکن یہ کبھی نہیں کہا ہے کہ گنہگار سے نفرت کرو۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک طبیب ہمیشہ لوگوں کو بیماریوں سے ڈراتا رہتا ہے اور ان کے مہلک نتائج کا ہولناک نقشہ پیش کرتا رہتا ہے، لیکن یہ تو وہ کبھی نہیں کرتا کہ جو لوگ بیمار ہو جائیں ان سے ڈرنے اور نفرت کرنے لگے بلکہ اس کی تو ساری توجہ اور شفقت کا مرکز بیماری کا وجود ہوتا ہے اور جو انسان جتنا زیادہ بیمار ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کی توجہ اور شفقت کا مرکز بن جائے گا۔ اور یہی شیوہ روح و دل کے طبیبوں کا بھی ہوتا ہے، وہ گنہگار سے نفرت نہیں کرتے بلکہ اس کیلئے سراپا رحمت و شفقت بن جاتے ہیں وہ یقیناً یہ چاہتے ہیں کہ ہم میں گناہوں سے نفرت پیدا کردیں، گنہگار انسانوں سے نہیں اور فرق و امتیاز کا یہی وہ نازک مقام ہے جہاں بڑے بڑے پیروانِ مذہب نے ٹھوکر کھائی ہے، حضرت مسیح کی تعلیم سرتاسر اسی حقیقت پر مبنی تھی کہ گناہوں سے نفرت کرو مگر ان انسانوں سے نفرت نہ کرو جو گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں بلکہ ان کے ساتھ لطف و رافت کا برتاؤ کرو تاکہ وہ اپنے ماضی کے گناہوں کی تلافی کرسکیں اور انسانی زندگی کے لئے دوبارہ ایک متاعِ عزیز بن جائیں، بعض ائمہ تابعین نے اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے "اِنْکِسَارُ الْعَاصِیْنَ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ صَوْلَۃِ الْمُطِیْعِیْنَ" خدا کو فرمانبردار بندوں کی تمکنت سے کہیں زیادہ گنہگار بندوں کا عجز و انکسار محبوب ہے" اور پھر یہی حقیقت ہے کہ ہم قرآن

میں دیکھتے ہیں کہ جہاں کہیں خدا نے گنہگار انسانوں کو مخاطب کیا ہے تو عموماً یائے نسبت کے ساتھ کیا ہے جو تشریف و محبت پر دلالت کرتی ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (۳۹: ۵۴) یا
(اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں کو) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ (۲۵: ۱۸)
کیا تم نے میرے بندوں کو گمراہ کیا تھا؟

اس طرز تخاطب کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک باپ جوش محبت میں بیٹے کو پکارتا ہے "اے میرے فرزند! اے میرے فرزند" پیغمبر کے پرتو اسے حضرت امام جعفر صادق نے سورۂ زمر کی آیۂ رحمت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے، "جب ہم اپنی اولاد کو اپنی طرف نسبت دے کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بے خوف و خطر ہماری طرف دوڑنے لگتے ہیں کیونکہ سمجھ جاتے ہیں ہم ان پر غضبناک نہیں" قرآن میں خدا نے بیس سے زیادہ موقعوں پر "عِبَادِيْ" کہہ کر اپنی طرف نسبت دی ہے، اور سخت سے سخت گنہگار انسان کو بھی "يٰعِبَادِيَ" کہہ کر پکارا ہے۔ کیا اس سے بھی بڑھ کر اس کی رحمت و آمرزش کا کوئی پیام ہو سکتا ہے!

انجیل اور قرآن کی تعلیمات میں کوئی اختلاف نہیں

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ فی الحقیقت حضرت مسیح کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں اصلاً کوئی فرق نہیں، دونوں کا معیار احکام ایک ہی ہے، فرق صرف محل بیان اور پیرایۂ بیان کا ہے۔ حضرت مسیح نے صرف تزکیۂ قلب پر زور دیا اور کوئی نئی شریعت نہیں پیش کی کیونکہ شریعت موسوی موجود تھی اور وہ اس میں تبدیلی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ اس شریعت کو تزکیۂ قلب کے لئے استعمال کیا جائے لیکن قرآن بیک وقت اخلاق اور قانون دونوں کے احکام بیان

کرتا ہے اس لئے قدرتی طور پر اس نے ایک ایسا اسلوب اور پیرایہ بیان اختیار کیا جو مجازات اور متشابہات کی جگہ احکام و قوانین کا صاف صاف چاتلا پیرایہ بیان تھا اس نے سب سے پہلے عفو و درگذر پر زور دیا اور اسے نیکی اور فضیلت کی اصل قرار دیا، دوسرے یہ کہ ناگزیر صورتوں میں بدلہ لینے اور سزا دینے کا دروازہ بھی کھلا رکھا اور تیسرے یہ نہایت واضح اور قطعی لفظوں میں اس نے کہدیا کہ بدلے اور سزا میں زیادتی نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ وہ ناانصافی ہوگی۔ تمام مذاہب کا ماحصل یہی تین اصول رہے ہیں۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا	اور دیکھو برائی کے بدلے ویسی ہی اور اتنی ہی
فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى	برائی ہے لیکن جو کوئی بخشدے اور بگاڑنے کی
اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝	جگہ سنوارے تو یقین کرو اس کا اجر اللہ
وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ	کے ذمے ہے، اللہ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا
فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ	جو زیادتی کرنے والے ہیں؛ اور جس کسی پر ظلم
سَبِيْلٍ ؕ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى	کیا گیا ہو اور وہ ظلم کے بعد اس کا بدلہ لے تو اس
الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ	پر کوئی الزام نہیں الزام ان لوگوں پر ہے
وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ	جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق ملک میں
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝	فساد کا باعث ہوتے ہیں سو یہی لوگ ہیں جن
وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ	کے لئے عذاب الیم ہے اور جو کوئی بدلہ لینے کے
لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۴۲: ۴۳)	بجائے برائی برداشت کرجائے اور بخش دے
	تو یقیناً یہ بڑی ہی اولوالعزمی کی بات ہے۔

غور کرو! عفو و درگذر پر پورا زور دیا گیا ہے، اگرچہ انتقام و سزا کا دروازہ کھلا رکھا گیا

ہے لیکن بتا دیا گیا ہے کہ نیکی وفضیلت کی راہ دراصل عفو ودرگذر ہی کی راہ ہے۔ پھر اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ قرآن نے اس سزا کو جو برائی کے بدلے میں دی جائے "برائی" ہی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی "سیئۃ" کے بدلے میں جو کچھ کیا جائے گا وہ بھی "سیئۃ کے مانند" ہی ہوگا بیشک برائی کبھی نیکی بن سکتی لیکن سزا کا دروازہ اس لئے کھلا رکھا گیا ہے کہ کہیں زیادہ بڑی برائیاں ظہور میں نہ آنے لگیں پھر اس آدمی کی نسبت جو معاف کر دے "اصلح" کا لفظ کہا ہے یعنی سنوارنے والا" اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کے اصلی سنوارنے والے وہی ہوئے جو عفو ودرگذر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہاں یہ خدشہ محسوس کیا جائے کہ اگر فی الحقیقت قرآن کی تعلیم کا اصل اصول رحمت ہی ہے تو پھر اس نے اپنے مخالفوں کی نسبت سخت پیرایہ کیوں اختیار کیا؟ اس کا مفصل جواب تو اپنے محل پر آئے گا لیکن یہاں اس سلسلہ میں ایک مختصر اشارہ کیا جاتا ہے، بلاشبہ قرآن میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں اس نے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے پیغمبر اسلام کے زمانہ میں قرآنی تعلیم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، بہت سخت پیرایہ بیان اختیار کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کن مخالفوں کے لئے؟ ان کے لئے جن کی مخالفت محض اختلافِ فکر وعقائد کی مخالفت تھی؟ یا ان کے لئے جن کی مخالفت نے جارحانہ معاندت کی شکل اختیار کر لی تھی؟ قرآن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ بات واضح ہو جائیگی کہ قرآن نے جہاں کہیں بھی مخالفوں کا ذکر کرتے ہوئے سختی کا اظہار کیا ہے وہ وہی مخالفین ہیں جنہوں نے قرآن پر ایمان لانے والوں کو عمداً ہلاک کیا اور ان کے ساتھ جارحانہ عناد وشرارت کا سلوک کیا، ایسے مخالفوں کے ساتھ بھی نرمی وشفقت کا برتاؤ انسانیت کی بدخدمتی کے مترادف ہوتا، یہ ایک ایسی رحمت ہوتی

جو ظلم و فساد اور شرارت و ناانصافی کی پرورش کرنے والی ہوتی۔ قرآن نے صفاتِ الٰہی میں رحمت کے ساتھ عدالت کو بھی جگہ دی ہے جس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا قرآن رحمت کو عدالت سے علیحدہ نہیں کرتا بلکہ اسے عینِ رحمت قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے تم انسانیت کے ساتھ رحم و محبت کا برتاؤ کر ہی نہیں سکتے اگر ظلم و شرارت کے لئے تم میں سختی نہیں ہے۔ انجیل میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ بھی اپنے زمانے کے مفسدوں کو "سانپ کے بچے" اور "ڈاکوؤں کی ٹولی" کہنے پر مجبور ہوئے۔

کفرِ محض اور کفرِ جارحانہ

قرآن نے کفر کا لفظ انکار کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ انکار دو طرح کا ہوتا ہے ایک انکار محض ایک انکار جارحانہ۔ کفرِ محض یا انکارِ محض کئی شکلیں اختیار کر سکتا ہے ایک شخص تمہاری تعلیم قبول نہیں کرتا اس لئے کہ وہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی یا اس میں طلب صادق نہیں ہے یا اس لئے کہ جس راستے پر وہ چل رہا ہے اسی پر قانع ہے، یہ کفرِ محض ہے۔ اس کے قرآن کہتا ہے اے پیغمبرؐ کہہ دے "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ" (تمہارے لئے تمہارا راستہ اور میرے لئے میرا راستہ) لیکن جارحانہ انکار انکارِ محض سے مختلف ہوتا ہے۔ جارحانہ انکار سے مقصود وہ حالت ہے جو صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اس میں تمہارے خلاف ایک طرح کی کد پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے مخالف اپنی پوری قوت کے ساتھ تمہاری ہلاکت و بربادی کے درپے ہو جائیں گے اور تم کتنی ہی سچی بات کہو وہ تمہیں جھٹلائیں گے اور تمہیں چین نہیں لینے دیں گے۔ اسی نوعیت کے مخالفین کی نسبت قرآن ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے جو سخت معلوم ہوتا۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ان کے پاس دل ہیں مگر سوچتے نہیں ان کے

وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷: ۱۷۹)

پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں، وہ ایسے ہو گئے ہیں جیسے چارپائے نہیں بلکہ چارپایوں سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ بلاشبہ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں ڈوب گئے۔

بنی نوع انسان کی تاریخ میں جب کبھی سچائی کی دعوت ظاہر ہوئی ہے تو کچھ لوگوں نے اسے قبول کر لیا ہے کچھ نے انکار کیا لیکن کچھ لوگ ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے عمداً پوری شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی ہے۔ قرآن کو ان تینوں قسم کی انسانی جماعتوں سے عہدہ برآ ہونا تھا اس نے پہلی جماعت کو اپنی آغوش تربیت میں لے لیا، دوسری جماعت کو اپنا پیام سنایا اور اس پر غور و خوض کرنے کی مہلت دی اور کہا کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ لیکن تیسری جماعت کے ساتھ وہ زجر و توبیخ سے پیش آیا۔ اگر ایسی جماعت کے لئے بھی قرآن لطف و رحمت کا لب و لہجہ اختیار کرتا تو اس کا مطلب جارحانہ قول و عمل کے آگے جھک جانے کے ہوتے اور یہ چیز قانون فطرت کے خلاف ہوتی رحمت ہمیشہ عدالت کے ساتھ ساتھ رہتی ہے، کائنات فطرت میں یہ عام قانون کارفرما ہے جس کی پابندی دنیائے انسانیت کے لئے بھی ضروری ہے۔

باب چہارم

خدا کی صفتِ عدل

ربوبیت اور رحمت کے بعد قرآن میں خدا کی جس صفت کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس کی صفتِ عدل ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ نزولِ قرآن کے وقت جزا کا جو اعتقاد تھا قرآن اسے رد کرتا ہے۔ وہ جزا کو انسان کے اعمال کا ناگزیر نتیجہ اور مکافات قرار دیتا ہے۔ جزا کا قدیم عقیدہ مطلق العنان بادشاہوں کی شاہنشاہیت اور الوہیت سے اخذ کردہ تھا اسی کی مشابہت میں لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ خدا بھی مطلق العنان بادشاہوں کی طرح من مانے انعام و اکرام اور سزائیں دینے لگتا ہے، اسی واسطے اس زمانہ کے لوگ دیوتاؤں کا جوشِ غضب ٹھنڈا کرنے کے لئے طرح طرح کی قربانیاں کرتے اور ان کی نظرِ التفات حاصل کرنے کے لئے نذریں چڑھاتے تھے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا تصورِ الٰہ دیومالائی تصور سے قدرے بلند ہو گیا تھا لیکن پرانے زمانے کے عام تصور کی بنیادی خصوصیت بدستور باقی تھی۔ یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ دوسروں کے دیوتاؤں کی طرح خدا ایک مطلق العنان بادشاہ تھا جو ان سے خوش ہوتا تو اسرائیل کے خدا کی حیثیت اختیار کر لیتا اور ناخوش ہوتا تو جوشِ انتقام میں آ کر ان کی بربادی و ہلاکت کا سبب بن جاتا۔ عیسائیوں کا اعتقاد تھا کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے

اس کی پوری نسل مغضوب ہو گئی اور جب تک خدا نے اپنی صفتِ ابنیت کو بشکل مسیح قربان نہیں کر دیا اس کے نسلی گناہ اور مغضوبیت کا کفارہ نہ ہو سکا۔

لیکن قرآن نے جزا و سزا کا اعتقاد ایک دوسری ہی شکل و نوعیت کا پیش کیا ہے، وہ اسے خدا کا کوئی ایسا فعل قرار نہیں دیتا جو کائناتِ ہستی کے عام قوانین و نظام سے الگ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک عالمگیر قانونِ مکافاتِ عمل پیرا ہے، کائناتِ ہستی کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے۔ فکر، احساس یا عمل کی شکل میں ہر شے کوئی نہ کوئی خاصہ رکھتی ہے اور اپنے اچھے یا برے اثرات مترتب کرتی ہے اور اسی کا نام جزا و سزا یا عذاب و ثواب ہے۔ اچھے عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہ ثواب ہے۔ اسی طرح برے عمل کا نتیجہ برائی ہے اور یہ عذاب ہے، ایک کو بہشت سے اور دوسرے کو دوزخ سے تعبیر کیا ہے، قرآن کا ارشاد ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی ایک مخصوص فطرت رکھتی ہے اور یہی حال انسانی اعمال کا بھی ہے۔ ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے اور اسی کو قرآن جزا و سزا، عذاب و ثواب یا عدالت کہتا ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

جو لوگ برائیاں کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں ہم انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان رکھتے ہیں اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ دونوں برابر ہو جائیں، زندگی میں بھی اور موت میں بھی؟ اگر ان لوگوں کی فہم و دانش کا یہی فیصلہ ہے تو، افسوس ان کے فیصلے پر! اور اللہ نے آسمان

بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ٥
(۴۵ : ۲۱ : ۲۲)

(زمین کو بیکار و عبث نہیں بنایا ہے، اور اس لیے بنایا ہے کہ ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق بدلہ ملے اور یہ بدلہ ٹھیک ملے گا کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر اچھے اور برے عمل کو "کسب" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے عربی میں کسب کے لفظی معنی ہیں ایسے کام جس کے نتیجہ سے تم کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہو۔ یعنی کسب کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے لئے جزا و سزا خود انسان ہی کی کمائی ہے۔ قرآن نے سورۂ بقرہ میں جزا و سزا کا قاعدہ کلیہ بتلا دیا ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط (۲ : ۲۸۶)

ہر انسان کے لئے وہی ہے جیسی کچھ اس کی کمائی ہوئی جو کچھ اسے پانا ہے وہ بھی اس کی کمائی سے ہے اور جس کیلئے اسے جواب دہ ہونا ہے وہ بھی اسکی کمائی سے ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ٥ (۴۱ : ۴۶)

جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے لئے کیا اور جس کسی نے برائی کی تو خود اسی کے آگے آئے گی اور ایسا نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار اپنے بندوں کے لئے ظلم کرنے والا ہو۔

اسی اصول کا اطلاق قوموں اور جماعتوں پر بھی ہوتا ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ

یہ ایک امت تھی جو گزر چکی۔ اس کے لئے وہ نتیجہ تھا جو اس نے کمایا اور تمہارے لئے وہ نتیجہ ہے

وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲:۱۳۴)

جو تم کماؤ گے

ایک مشہور حدیث قدسی میں اسی اصولِ حیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:-

يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى اَتْقٰى قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْكُمْ مَا زَادَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئًا يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْكُمْ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِيْ شَيْئًا. يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ قَامُوْا فِيْ صَعِيْدٍ وَّاحِدٍ فَسَاَلُوْنِيْ فَاَعْطَيْتُ كُلَّ اِنْسَانٍ مَسْئَلَتَهٗ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِيْ اِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ اِذَا اُدْخِلَ الْبَحْرَ. يَا عِبَادِيْ اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ اُحْصِيْهَا لَكُمْ

اے میرے بندو! اگر تم میں سے سب انسان جو پہلے گذر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام انس اور تمام جن اس شخص کی طرح نیک ہو جائیں جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے تو یاد رکھو اس سے میری خداوندی میں کچھ اضافہ نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گذر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام انس اور تمام جن اس شخص کی طرح بدکار ہو جائیں جو تم میں سب سے زیادہ بدکار ہے تو اس سے میری خداوندی میں کچھ نقصان نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گذر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے اور میں ہر انسان کو اس کی منہ مانگی مراد بخش دیتا تو میری رحمت و بخشش کے خزانے میں اس سے زیادہ

ثُمَّ اُوَفِّيكُمْ إِيَّاهَا فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ

(مسلم عن ابی ذرؓ)

کمی نہ ہوئی جتنی کمی سوئی کے ناکے کے جتنا پانی نکل جانے سے سمندر میں ہو سکتی ہے اے میرے بندو یاد رکھو یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جنہیں میں تمہارے لئے انضباط اور نگرانی میں رکھتا ہوں اور پھر انہیں کے نتائج بغیر کسی کمی بیشی کے تمہیں واپس دے دیتا ہوں پس جو کوئی تم میں اچھائی پائے چاہیے کہ اللہ کی حمد و ثنا کرے اور جس کسی کو برائی پیش آئے تو چاہیے کہ خود اپنے وجود کے سوا اور کسی کو ملامت نہ کرے۔

یہاں یہ خدشہ کسی کے دل میں واقع نہ ہو کہ جزا و سزا محض خدا کی خوشنودی یا ناراضی کا نتیجہ ہے۔ ارشاد قرآنی یہ ہے کہ جزا و سزا تمامتر انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے اور خدا نیک عمل سے خوش ہوتا ہے اور بد عمل سے ناراض ہوتا ہے یہ تصور اس کے پہلے کے معتقدات کا نقیض ہے، بہر حال جزا و سزا کے اس قانون کے لئے الدین کی اصطلاح نہایت موزوں ہے اور ان تمام غلط تصورات کا خاتمہ کر دیتی ہے جو اس بارے میں پھیلی ہوئی تھیں، سورۂ فاتحہ میں اس کے استعمال نے نیکی اور برائی سے پیدا ہونے والے نتائج یعنی جزا و سزا کی اصلی حقیقت آشکار کر دی ہے

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن نے ربوبیت اور رحمت کے بعد خدا کی صفت

قہر و جلال میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا ہے بخلاف ازیں وہ خدا کو "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" بیان کرتا ہے جس سے ربوبیت اور رحمت دونوں صفات کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی صفت عدل کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن نے خدا کی صفات کا جو تصور قائم کیا ہے اس میں قہر و غضب کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ البتہ عدل ضرور ہے اور صفات قہریہ جس قدر بیان کی گئی ہیں دراصل اسی کے مظاہر ہیں جو بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے کام کرتی رہتی ہیں۔

فی الحقیقت صفات الٰہی کے تصور کا یہی وہ مقام ہے جہاں فکر انسانی نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی، اس نے کائناتِ ہستی کے تمام ناخوشگوار واقعات کو خدا کی ناراضگی کا مظہر قرار دے دیا اور قہر و غضب کی صفات کو صفات الٰہی پر محمول کر لیا، حالانکہ اگر وہ فطرتِ کائنات کی حقیقت کو قریب سے دیکھتا تو معلوم کر لیتا کہ جن مظاہر کو وہ خدا کے قہر و غضب پر محمول کر رہا ہے وہ عین مقتضائے رحمت ہیں۔ اگر فطرت کائنات میں قانون مکافات جاری و ساری نہ ہوتا یا مدارج تکمیل طے کرنے کے لئے راستہ کے حائلات دور نہ کئے جاتے تو میزان عدل قائم نہ رہتا اور تمام نظام ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

جس طرح کارخانہ خلقت اپنے وجود و بقا کے لئے خدا کی ربوبیت اور رحمت کا محتاج ہے اسی طرح اپنی تکمیل کے لئے اس کے عدل کا بھی محتاج ہے ربوبیت اور رحمت زندگی کے لئے افادہ و فیضان کا سرچشمہ ہے اور عدل سے بناؤ اور خوبی ظہور میں آتی ہے اور نقصان و فساد کا ازالہ ہوتا ہے۔ اگر تم کائنات خلقت کے اس پہلو کا بہ نظر غور مشاہدہ کرو تو دیکھو گے کہ یہاں خوبی و جمال

اور بناؤ و سلجھاؤ میں سے جو کچھ ہے وہ سب کچھ قوتِ عدل کا ظہور ہے۔

عربی میں معدلت یا عدل کے معنی برابر ہونا۔ عدالت کا کام دو فریقوں کی باہم گر زیادتیوں کو دور کر دینا ہوتا ہے۔ ترازو کے تولی کو بھی عدل یا معدلت کہتے ہیں کیونکہ وہ دونوں پلڑوں کا وزن برابر کر دیتا ہے۔ معدلت زندگی میں تناسب پیدا کر دیتا ہے اور ایک جز کو دوسرے جز کے برابر لاکر اتحاد یا ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتی ہے یہی قانون ہے جو زندگی اور فکر کے ہر اسلوب میں حسن و تناسب کا نکھار پیدا کرتا ہے۔ کارخانہ ہستی کا سارا نظام ہی عدل و توازن پہ قائم ہے۔ نظام شمسی کا ہر کرہ ہر ستارہ ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص نظام توازن میں جکڑا ہوا اپنے اپنے دائروں میں حرکت کر رہا ہے۔ یہی وہ قانون ہے جو نظام معاشرت کو برقرار رکھے ہوئے ہے، اگر ایک لمحہ کے لئے بھی یہ ساکت ہو جائے تو تمام نظام عالم مختل ہو کر رہ جائے۔

قرآن ہم سے یہ غور کرنے کا مطالبہ کرتا ہے کہ جب یہ اصولِ نصفت کائناتِ خلقت کے ہر گوشے میں نافذ ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال و افکار اس کے اثر سے خارج ہو جائیں۔ اسی لئے اس پورے عملِ توازان و تناسب کو جو زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما ہے، قرآن عمل صالح کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بدعملی یا برائی کے لئے جتنی تعبیرات اختیار کی ہیں سب ایسی ہی ہیں کہ اگر ان کے معانی پر غور کیا جائے تو عدل و توازن کی ضد اور مخالف ثابت ہوں گی، مثلاً ظلم، طغیان

اسراف، تبذیر، افساد، اعتدا، اور عدوان وغیرہ جسے ہم ظلم کہتے ہیں۔ عربی میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جو بات جس جگہ ہونی چاہیئے وہاں نہ ہو یا بے محل ہو اسی لئے قرآن نے شرک کو "ظلم عظیم" کہا ہے کیونکہ اس سے زیادہ کوئی بے محل بات نہیں ہو سکتی اور یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کا بے محل ہونا یا اپنی صحیح جگہ پر نہ ہونا ایک ایسی حالت ہے جو حقیقت عدل کے عین منافی ہے۔ اسی طرح طغیان کے معنی ہیں۔ کسی چیز کا اپنی حد سے گذر جانا، جب دریا کا پانی اپنی حد سے بلند ہو جاتا ہے تو طغیان کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حد سے تجاوز، توازن و عدل کے منافی ہے۔ اسراف (فضول خرچی) تبذیر (غلط استعمال) اور افساد (شرارت و فساد) بھی اسی شعبہ میں آتے ہیں۔ اعتدا اور عدوان دونوں کے معنی حد سے گذر جانے کے ہیں، پس ہر وہ شے جو بے محل ہو تعمیر و تکمیل کے راستے کی رکاوٹ ہے جس کو راستے سے ہٹا دینا چاہیئے۔ اور عدل یہی کام انجام دیتا ہے جو قرآن کے الفاظ میں خدا کی رحمت یا رحمانیت کا اظہار ہے



باب پنجم

وحدت دین

جزا و سزا کا قانون جس کا گذشتہ باب میں ذکر ہوا ہے۔ انسانی ذمہ داریوں کے سوال سے بحث کرتا ہے ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ عذاب وثواب انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ربوبیت الٰہی جس کا مقصد کائنات ہستی کی پرورش اور نشوونما ہے انسان کو یہ صلاحیت عطا کرتی ہے کہ وہ یقین واطمینان کے ساتھ اپنی ان ذمہ داریوں کو پورا کر سکے جس سے زندگی میں سابقہ پڑتا ہے بہ الفاظ دیگر کیا انسان میں اس بات کی استعداد ہوتی ہے اور کیا اسے ایسے مواقع ملتے ہیں کہ وہ اپنے لئے وہ راہ عمل انتخاب کر سکے جو اس کو مطلوبہ بھلائی کی طرف لیجائے تاکہ اس کے اعمال وافعال پر جزا و سزا کے قانون کو حق بجانب قرار دیا جا سکے؟ قرآن اس کا جواب اثبات میں دیتا ہے:۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ﴿۲﴾ وَ
اَلَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ﴿۳﴾
(۸۷ : ۲)

وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی
پھر اسے درست کیا، پھر ایک اندازہ
ٹھیرا دیا پھر اس پر راہ عمل کھولدی

اس آیت میں تکوین وجود کے جو مرتبے بیان کئے گئے ہیں، وہ تخلیق، تسویہ

تقدیر و ہدایت کے مرتبے ہیں۔ ارشاد قرآنی ہے کہ جس طرح خدا کی ربوبیت نے ہر وجود کو اس کا جامۂ ہستی عطا فرمایا، اس کے ظاہری و باطنی قوئی درست کئے اور اس کے اعمال کے لئے ایک مناسب حال اندازہ ٹھہرا دیا۔ اسی طرح اس کی ہدایت کا بھی سرو سامان کر دیا۔

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰ : ۵۰)

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر راہ عمل کھول دی

پھر قرآن نے ہدایت کے بھی چار مرتبے بیان کئے ہیں، وجدان، حواس عقل اور وحی و نبوت۔ ہدایت کے پہلے دو مرتبے انسان اور حیوان سب کے لئے ہیں لیکن تیسرا مرتبہ یعنی مرتبہ عقل انسان کے لئے خاص ہے۔ لیکن یہ سب مرتبے اپنا محدود دائرہ عمل رکھتے ہیں۔ جہاں وجدان کی ہدایت ختم ہو جاتی ہے حواس کی ہدایت رہبری کرنے کے لئے آجاتی ہے اور اسی طرح جب حواس کی ہدایت اپنی حد تک پہنچ جاتی ہے تو عقل کی ہدایت دستگیری کرتی ہے لیکن عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتی، اسی لئے ضروری تھا جیسا کہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے، کہ انسان کے لئے خدا کی ربوبیت اور رحمت کے ساتھ ایک چوتھے مرتبہ ہدایت کا بھی سامان کر دیا جائے یہی مرتبہ ہدایت ہے جسے قرآن وحی و نبوت کی ہدایت سے تعبیر کرتا ہے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی ط (۲ : ۱۲۰)

(اے پیغمبر) ان سے کہدو اللہ کی ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو (الھدیٰ) ہے (یعنی ہدایت کی حقیقی اور عالمگیر راہ)

یہ "الھدیٰ" کی اصطلاح ہے جس کے ذریعہ خدائی ہدایت کا اظہار کیا گیا ہے اس کا مطلب ہے کہ ہدایت کی ایک ہی حقیقی راہ، اسی عالمگیر ہدایت وحی کو قرآن نے "الدین" اور "الاسلام" کے نام بھی دیئے ہیں، یعنی خدا کے بنائے ہوئے قوانینِ حیات کو تسلیم کرنے کا راستہ۔

وحدتِ دین قرآنی تعلیم کا اصل اصول یہی وحدتِ دین ہے جو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے لیکن مولانا آزاد کہتے ہیں کہ تاریخِ عالم کے عجائب تصرفات میں سے یہ واقعہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ جس درجہ قرآن نے اس اصل پر زور دیا تھا اتنا ہی زیادہ دنیا کی نگاہوں نے اس سے اعراض کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی کوئی اور صداقت دنیا کی نظروں سے اس قدر پوشیدہ نہیں ہے جس قدر کہ یہ اصل عظیم، اگر ایک شخص ہر طرح کے خارجی اثرات سے خالی الذہن ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے اور اس میں جا بجا اس اصل عظیم کے قطعی اور واضح اعلانات پڑھے اور پھر دنیا کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے تو وہ حیران ہو کر رہ جائے گا کہ ان قطعی اعلانات کے باوجود قرآن کی حقیقت کو بھی بہت سی مذہبی گروہ بندیوں کی طرح ایک مذہبی گروہ بندی کی حیثیت دیدی گئی ہے۔

اس حقیقت کی توضیح کے لئے مولانا آزاد نے ضروری سمجھا کہ تفصیل کے ساتھ اس بات پر روشنی ڈالی جائے کہ جہاں تک وحی و نبوت کا تعلق ہے قرآن کی دعوت کیا ہے، اور وہ کس راہ کی طرف نوعِ انسانی کو لیجانا چاہتا تھا۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ اس باب میں قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ:۔ ابتدا میں نسل انسانی ایک قوم کی طرح رہتی اور قدرتی زندگی بسر کرتی تھی بعد میں چل کر کثرت اور ضروریات معیشت کے دباؤ کے باعث طرح طرح کے اختلافات پیدا ہوگئے اور جمعیت انسانی مختلف گروہوں میں بٹ گئی اور ہر گروہ دوسرے سے نفرت کرنے لگا۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوگئی تو تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی ہدایت کے لئے عدل و صداقت کی روشنی نمودار ہو تاکہ وہ پھر متحد ہو سکیں، چنانچہ خدا کے رسولوں کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم ہوگیا اور نوع انسانی کو اتحاد و یگانگت کی تعلیم دینے کے لئے یکے بعد دیگرے خدا کے نبیوں کا ظہور ہونے لگا۔ انسانیت کے ان محسنوں کو خدا، رسل، (واحد رسول) یا پیغمبر کے لقب سے یاد کرتا ہے کیونکہ وہ بنی نوع انسان کو خدا کی سچائی کا پیام پہنچانے والے تھے ان تمام پیغمبروں کا پیام ایک ہی تھا اور کسی خاص گروہ یا ملک یا قوم کے لئے مخصوص نہ تھا، قرآن کا ارشاد ہے کہ دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں نسل انسانی آباد ہوئی ہو اور خدا کا کوئی رسول مبعوث نہ ہوا ہو وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ (۸ : ۱۳) قرآن کہتا ہے کہ کتنے ہی پیغمبر یکے بعد دیگرے مبعوث ہوئے جنہوں نے قوموں کو پیغام حق پہنچایا۔ ان میں سے بعض کا نام قرآن میں لیا گیا ہے اور بعض کا نہیں۔

وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِن نَّبِيٍّ فِي الْأَوَّلِينَ (۴۳ : ۵)

اور کتنے ہی نبی ہیں جو ہم نے پہلوں میں (یعنی ابتدائی عہد کی قوموں میں) مبعوث کئے

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا

(۱۷ : ۱۶)

اور (ہمارا قانون یہ ہے کہ) جب تک ہم ایک پیغمبر مبعوث کر کے راہ ہدایت نہ دکھا دیں اس وقت تک (پاداش عمل میں) عذاب دینے والے نہیں

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ

(۴۰ : ۷۸)

اور (اے پیغمبر) ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی پیغمبر مبعوث کئے، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے حالات تمہیں سنائے ہیں کچھ ایسے ہیں جن کے حالات نہیں سنائے (یعنی قرآن میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا)

ہر عہد میں خدا کا راستہ ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، وہ کسی حال میں بدل نہیں سکتا، پس بنی نوع انسان کے لئے اس کی ہدایت بھی اول دن سے ایک ہی طرح کی ہے اور یہ ہدایت کیا تھی، صرف یہ کہ خدائے واحد پر ایمان لاؤ اور نیک عملی کی زندگی بسر کرو، ہر عہد میں اور ہر قوم کے لئے خدا نے دین کا یہی ایک راستہ بنایا۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ج

(۱۶ : ۳۸)

اور بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا (جس کی تعلیم یہ تھی) اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے (یعنی سرکش اور شریر قوتوں کے اغواء سے) اجتناب کرو۔

قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی بانیٔ مذہب بھی ایسا نہیں ہوا ہے جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو۔ سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لئے ہے۔ پس اس غرض کے لئے ایک پروردگار عالم کی بندگی میں سب متحد ہو جاؤ اور تفرقہ و مخاصمت کی جگہ باہمی محبت اور یک جہتی کی راہ اختیار کرو۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ○ (۲۳ : ۵۲)

اور (دیکھو) یہ تمہاری امت فی الحقیقت ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں پس (میری عبودیت و نیاز کی راہ میں تم سب ایک ہو جاؤ اور) نافرمانی سے بچو۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ○

(۴۲ : ۱۳)

اور (دیکھو) اس نے تمہارے لئے دین کی وہی راہ قرار دی ہے جس کی وصیت نوح کو کی گئی تھی اور جس پر چلنے کا حکم ابراہیم موسیٰ و عیسیٰ کو دیا تھا (ان سب کی تعلیم یہی تھی) کہ الدین (یعنی خدا کا ایک ہی دین) قائم رکھو اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر الہامی کتاب نے خدا کی راہ پر چلنے کی تعلیم دی ہے۔

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ ۚ هَٰذَا ذِكْرُ مَن مَّعِيَ وَذِكْرُ مَن قَبْلِي ۗ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقَّ ۖ فَهُم مُّعْرِضُونَ ۝ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ۝ (۲۱ : ۲۴ : ۲۵)	اے پیغمبر ان سے کہدو اگر تمہیں میری تعلیم سے انکار ہے تو اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ تعلیم موجود ہے جس پر میرے ساتھی یقین رکھتے ہیں اور اسی طرح وہ تمام تعلیمیں موجود ہیں جو مجھ سے پہلے قوموں کو دی گئیں (تم ثابت کر دکھاؤ کسی نے بھی میری تعلیم کے خلاف تعلیم دی ہو) اصل یہ ہے کہ (ان منکرین حق میں) اکثر آدمی ایسے ہیں جنہیں سرے سے امر حق کی خبر ہی نہیں اور اس لئے حقیقت کی طرف سے گردن موڑے ہوئے ہیں (اے پیغمبر! یقین کر) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر بھی ایسا نہیں بھیجا جسے اس بات کے سوا کوئی دوسری بات بتلائی گئی ہو کہ "میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو۔

اتنا ہی نہیں بلکہ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ ہر پیغمبر کی تعلیم دوسرے پیغمبر

کی تعلیم کی تصدیق کرتی ہے کیونکہ سب کی تعلیم ایک ہی تھی۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ۝ مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ (۳ : ۲)

(اے پیغمبر) اللہ نے تم پر یہ کتاب سچائی کے ساتھ نازل کی ہے جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور اسی طرح لوگوں کی ہدایت کے لیے اس نے تورات اور انجیل نازل کی ہے۔

الدین اور الشرع

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وحی الٰہی نے ایک ہی اصول زندگی کی تعلیم دی ہے ایک ہی اصل اور قانون کی تعلیم دی ہے تو پھر مذاہب میں اختلاف کیوں پیدا ہوا اور تمام مذہبوں میں ایک ہی طرح کے احکام، ایک ہی طرح کے رسوم و ظواہر کیوں نہ ہوئے؟

قرآن کہتا ہے کہ مذاہب کا اختلاف دو طرح کا ہے۔ ایک اختلاف تو وہ ہے جو پیروانِ مذاہب نے مذہب کی حقیقی تعلیم سے منحرف ہو کر پیدا کر لیا ہے۔

دوسرا اختلاف وہ ہے جو مذہبی تعلیم کے نفاذ و اطلاق میں پایا جاتا ہے، مثلاً ایک مذہب میں عبادت کی کوئی خاص شکل مقرر کی گئی ہے، دوسرے میں کوئی دوسری شکل، تو یہ اختلاف دین کا اختلاف نہیں ہے بلکہ اس کی تعلیم کے اطلاق یعنی شرع کا اختلاف ہے

اس لئے دین اور شرع میں فرق کرنے کی ضرورت ہے دین میں کسی قسم کا انحراف قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ہر عہد اور ہر قوم کے لئے وہ ایک ہی ہوتا ہے لیکن انسانی جمعیت کے احوال و ظروف ہر عہد میں بدلتے رہتے ہیں۔ پس ہر زمانے کے مزاج اور اس دور کے لوگوں کی استعداد و طبیعت کے مطابق شرع و منہاج کی شکل میں تبدیلی ضرور ہوتی رہی اور جب تک خدا کی توحید اور نیک عمل کے بنیادی راستے میں اس کی وجہ سے انحراف نہیں ہوتا اس میں کوئی قباحت نہیں۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ط اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ہ

(۲۲ : ۶۷)

(اے پیغمبر) ہم نے ہر گروہ کے لئے عبادت کا ایک خاص طور طریقہ ٹھیرا دیا ہے جس پر وہ چلتا ہے پس لوگوں کو چاہیئے اس معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں۔ تم لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف دعوت دو یقیناً تم ہدایت کے سیدھے راستے پر گامزن ہو

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ط اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہ

(۲ : ۱۴۸)

اور (دیکھو) ہر گروہ کے لئے کوئی نہ کوئی سمت ہے جس کی طرف عبادت کرتے ہوئے وہ اپنا منہ کر لیتا ہے پس (اس معاملہ کو اس قدر طول نہ دو) نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو (کہ اصلی کام یہی ہے) تم کسی جگہ بھی ہو

اللہ تم سب کو پالے گا۔ یقیناً اللہ کی
قدرت سے باہر کوئی چیز نہیں۔

ان آیتوں پر نظر ڈالنے سے دین اور منہاج شریعت کا فرق واضح ہو جاتا ہے، دین عبارت ہے ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی سے اور شرع نام ہے اس اصول کو روبہ عمل لانے کا اور اس کو جانچنے کا معیار اچھائیوں کے نتائج و نوعیت پر منحصر ہوتا ہے دین کے حقیقی عناصر کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے :۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ

اور (دیکھو) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے (عبادت کے وقت) اپنا منہ پورب کی طرف اور پچھم کی طرف کر لیا (یا اس طرح کی کوئی دوسری بات ظاہری رسم اور ڈھنگ کی کر لی) نیکی کی راہ تو اس کی راہ ہے جو اللہ پر آخرت کے دن پہ، ملائکہ پر، تمام کتابوں پر اور تمام نبیوں پر ایمان لاتا ہے، اپنا مال خدا کی محبت کی راہ میں، رشتہ داروں یتیموں مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیتا ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں خرچ کرتا ہے نماز قائم کرتا ہے زکوٰۃ ادا کرتا ہے، قول و قرار کا پکا ہوتا ہے۔ تنگی

وَالضَّرَّاءِ وَحِيْنَ الْبَاسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (۲: ۱۷۷)	اور مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف وہراس کا وقت، ہر حال میں ثابت قدم رہتا ہے سو یاد رکھو (ایسے ہی لوگ ہیں جو اپنی دینداری میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو برائیوں سے بچنے والے ہیں۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ تیرہ سو برس سے زیادہ قرآن میں یہ آیت موجود ہے اس کے باوجود اگر قرآن کی دعوت کے اصل مقصد کو دنیا اب تک نہیں سمجھ سکی ہے تو بلاشبہ یہ قرآن کا قصور نہیں ہے۔

دین کی وحدت کو فراموش کر دیا گیا

جب قرآن کا ظہور ہوا تو حال یہ تھا کہ تمام مروجہ مذاہب کے پیرو مذہب کو صرف اس کے رسوم وظواہر میں دیکھتے تھے اور مذہبی اعتقاد کا تمام جوش وخروش اسی قسم کی باتوں میں سمٹ گیا تھا، ہر گروہ کا یہ ایمان تھا کہ دوسرا گروہ نجات سے محروم رہے گا۔ محض اس بنا پر کہ دوسرے کے اعمال ورسوم ویسے نہیں ہیں جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں یہ اعمال ورسوم نہ تو دین کی اصل ہیں اور نہ سچائی کی کسوٹی بلکہ یہ دین کا محض ایک ظاہری ڈھانچہ ہیں۔ روح وحقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے، یہ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی، یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسانی کی مشترکہ میراث ہے، اعمال ورسوم کی حیثیت فروعی

ہے جو وقتاً فوقتاً بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم میں سے ہر جماعت کے لئے ہم نے ایک قانون (شرع) اور ایک کھلا راستہ (منہاج) ٹھہرا دیا ہے۔ یہاں دین کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ کیونکہ دین تو سب کے لئے ایک ہی ہے۔ اس میں انحراف و تنوع نہیں ہو سکتا البتہ شرع و منہاج قدرتی طور پر سب کے لئے یکساں نہیں ہو سکتے تھے۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جہاں کہیں قرآن نے اس چیز پر زور دیا ہے کہ ۔ "اگر خدا چاہتا تو تمام انسان ایک ہی راہ پر جمع ہو جاتے یا ایک ہی قوم بن جاتے" وہ اس بات کو لوگوں کے دلوں میں اتار دینا چاہتا ہے کہ مختلف ملکوں میں رہنے والی مختلف اقوام کے مختلف گروہوں میں فکر و عمل کا اختلاف موجود ہے اور یہ طبیعت بشری کا قدرتی خاصہ ہے۔ پس اس اختلاف کو حق و باطل کا معیار اور انسانی گروہوں کی باہمی نفرت و عداوت کا موجب نہیں بننا چاہیئے۔ البتہ مذہب کی اصل بنیاد یعنی ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کو اس سے نقصان نہ پہنچنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے قرآن نے تحمل و رواداری پر بہت زور دیا ہے یہاں تک کہ جو لوگ اس کی دعوت توحید کے خلاف جبر و تشدد سے کام لے رہے تھے ان کی طرف سے بھی اسے معذرت کرنے میں تامل نہیں

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ — (اور دیکھو) جو لوگ خدا کو چھوڑ کر

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (٦ : ١٠٨)

دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں تم ان پر سب و شتم نہ کرو کیونکہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ لوگ بھی از راہ جہل و نادانی خدا کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔ یاد رکھو! ہم نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر گروہ کو اپنا ہی عمل اچھا دکھائی دیتا ہے، پھر بالآخر سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے اور وہیں ہر گروہ پر اس کے اعمال کی حقیقت کھلنے والی ہے۔

ایک موقع پر خود پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ٥

(١٠ : ٩٩)

اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو زمین میں جتنے انسان ہیں سب ایمان لے آتے لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ ہر انسان اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے، پھر کیا تم چاہتے ہو لوگوں کو مجبور کر دو کہ مومن ہو جائیں

تجدید دعوت

ایسی صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام مذاہب کی اصل ایک ہی ہے اور سب کی

بنیاد سچائی پر ہے تو پھر ظہور قرآن کی ضرورت کیا تھی؟ قرآن اس کا جواب دیتا ہے گو تمام مذاہب سچے ہیں لیکن تمام مذاہب کے پیرو سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ سب کو ان کی گمشدہ سچائی پر ازسرنو جمع کر دیا جائے اور قرآن کا یہی کام ہے۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ سچائی اور دین سے پیروان مذاہب کی گمراہیاں اعتقادی اور عملی دونوں طرح کی تھیں اور ان گمراہیوں نے مختلف شکلیں اختیار کر لی تھیں۔ ایک سب سے بڑی گمراہی جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے اسے "تشیع" اور "تحزب" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی ہیں الگ الگ جتھے بنا لینا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِيَعًا لَّسۡتَ مِنۡهُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمۡرُهُمۡ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ ۝

(۶ : ۱۵۸)

جن لوگوں نے اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ گئے تمہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ خدا کے حوالے ہے جیسے کچھ ان کے عمل رہے ہیں اس کا نتیجہ خدا انہیں بتلا دے گا۔

فَتَقَطَّعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ بَيۡنَهُمۡ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزۡبٍۢ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ ۝

(۲۳ : ۵۲)

پھر لوگوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر جدا جدا دین بنا لئے۔ ہر ٹولی کے پلے جو کچھ پڑ گیا ہے اسی میں مگن ہے۔

تشیع تشیع اور تحزب کے الفاظ کہاں سے آئے اسے پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیئے، خدا کے ٹھہرائے ہوئے دین کی حقیقت تو یہ تھی کہ وہ نوع انسانی پر خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ کھولتا تھا لیکن لوگوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا اور انسانیت، نسلوں، قوموں، ملکوں اور طرح طرح کی رسموں اور رواجوں میں بٹ گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اعتقاد و عمل کے بجائے سارا دارومدار اس پر آکر ٹھہر گیا کہ کون کس کے جتھے اور گروہ میں داخل ہے اور اسی کو صداقتِ دین کی کسوٹی بنا لیا گیا، گویا دین کی سچائی، آخرت کی نتیجہ اور حق و باطل کا معیار تمام تر گروہ بندی اور گروہ پرستی ہو گئی، اور ہر گروہ یقین کرنے لگا کہ دوسروں پر نجات کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور وہی نجات کا مستحق ہے اور فی الحقیقت دوسرے مذاہب کی نفرت نے خدا پرستی اور نیک عملی کی جگہ لے لی۔

قرآنی رویہ قرآن کو گمراہی کا یہ طلسم توڑنا تھا چنانچہ اس نے انسان کی نجات و سعادت کا دارومدار کسی خاص گروہ بندی پر نہیں بلکہ اعتقاد و عمل پر رکھا، اس نے اس بات پر زور دیا کہ نوع انسانی کے لئے دین الٰہی ایک ہی ہے اور اس راستے سے انحراف دین کی نفی ہے، اس نے بتایا کہ اصل دین توحید ہے یعنی کسی واسطے کے بغیر ایک خدا کی براہ راست پرستش اور تمام بانیان مذاہب نے اسی کی تعلیم دی ہے، اس کے خلاف دین سے متخاصم ہونے والے جتنے عقائد و اعمال ہیں، وہ خدا کے انکار کی تعریف میں آتے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ
إِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا أَوْ نَصٰرٰى
تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا
بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ○ بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ
وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ
فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا
هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

(۲۰ : ۶ : ۱)

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَالَّذِيْنَ
هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ
مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ

اور یہود و نصاریٰ نے کہا جنت میں کوئی انسان
داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہودی
اور نصاریٰ نہ ہو (یعنی جب تک یہودیت
اور نصرانیت کی گروہ بندیوں میں داخل
نہ ہو) یہ ان لوگوں کی (جاہلانہ) امنگیں
ہیں (اے پیغمبر) ان سے کہدو اگر تم (اس
زعم باطل میں) سچے ہو تو بتلاؤ تمہاری
دلیل کیا ہے؟ ہاں (بلاشبہ نجات کی راہ
کھلی ہوئی ہے مگر وہ کسی خاص گروہ بندی
کی راہ نہیں ہو سکتی وہ تو ایمان و عمل کی راہ
ہے) کسی نے بھی خدا کے آگے سر جھکا دیا
اور وہ نیک عمل بھی ہوا تو (خواہ وہ یہودی
اور نصرانی ہو خواہ کوئی ہو) وہ اپنے پروردگار
سے اپنا اجر پائے گا۔ اس کے لئے نہ تو
کسی طرح کا کھٹکا ہے نہ کسی طرح کی غمگینی
جو لوگ (پیغمبر اسلام پر) ایمان لائے ہوں
وہ ہوں یا وہ لوگ ہوں جو یہودی کہلاتے
ہیں یا نصاریٰ اور صابی ہوں (کوئی بھی
ہو) لیکن جو کوئی بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان

اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ٥ (۲ : ۶۲)	لایا اور اس کے کام بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان و عمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا، اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہے نہ کسی طرح کی غمگینی۔

یعنی قرآن کے الفاظ میں دین کسی گروہ بندی کا نام نہ تھا، انسان کا تعلق کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک سے ہو اگر وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اس کے اعمال بھی نیک ہیں یعنی اس کی زندگی نیک عملی کا نمونہ ہے تو دین الٰہی پر چلنے والا ہے اور اس کے لئے نجات ہے، لیکن یہودیوں اور عیسائیوں نے صرف اپنے لئے ایک خاص قسم کا ضابطۂ فکر و اخلاق بنا لیا، یہودیوں نے گروہ بندی کا ایک دائرہ کھینچا اور اس کا نام "یہودیت" رکھ دیا۔ عیسائیوں نے بھی اپنے اطراف ایسا ہی ایک حلقہ بنا لیا اور اس کو "مسیحیت" کا نام دے دیا اور ہر ایک نے یہی کہا کہ جو اس کے دائرے میں شامل ہے وہی سچائی پر ہے اور نجات اسی کے لئے ہے اور جو اس سے باہر ہے وہ نجات سے قطعاً محروم ہے اور اس طرح ایمان باللہ اور نیک عملی کا عالمگیر تصور یک قلم غیر موثر ہو گیا، ایک شخص کتنا ہی خدا پرست اور نیک عمل ہو لیکن اگر وہ "یہودیت" یا "مسیحیت" کے دائروں میں داخل نہیں ہے تو اسے کوئی یہودی یا عیسائی ہدایت یافتہ انسان نہیں سمجھے گا لیکن ایک انتہائی بدعمل اور بداعتقاد انسان بھی نجات یافتہ سمجھ لیا جائے گا، اگر وہ گروہ بندیوں کے اس نظام میں داخل ہے۔ قرآن اس قسم کی گروہ بندیوں کو مسترد کر دیتا ہے، وہ اعلان

کرتا ہے کہ کوئی انسان ہو، کسی نسل و قوم یا گروہ کا ہو اگر اس نے اللہ کے آگے عبودیت کا سر جھکایا اور نیک عملی کی زندگی اختیار کی تو اس نے نجات و سعادت پالی اور اس کے لئے کوئی غم اور کھٹکا نہیں۔ مذہبی صداقت کی عالمگیر وسعت کلی یہی وہ تصور ہے جو قرآن ظاہر کرتا ہے لیکن وہ افسوس کے ساتھ کہتا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (۲ : ۱۱۳)

اور یہودیوں نے کہا عیسائیوں کا دین کچھ نہیں ہے اسی طرح عیسائیوں نے کہا یہودیوں کے پاس کیا دھرا ہے؟ حالانکہ دونوں اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں (اور دونوں کا سرچشمہ دین ایک ہی ہے) ٹھیک ایسی ہی بات ان لوگوں نے بھی کہی جو (مقدس نوشتوں کا) علم نہیں رکھتے (یعنی مشرکین عرب نے کہ وہ بھی صرف اپنے ہی کو نجات کا وارث سمجھتے ہیں) اچھا جس بات میں باہم جھگڑ رہے ہیں قیامت کے دن اللہ اس کا فیصلہ کر دے گا اور اس وقت حقیقت حال سب پر کھل جائے گی۔

یہودیوں نے تو یہ انتہا کر دی تھی کہ وہ سمجھنے لگے تھے کہ جہنم کی آگ انہیں چھو بھی نہیں سکتی لیکن قرآن صاف لفظوں میں اعلان کرتا ہے کہ جس کسی

نے بھی اچھا کام کیا اس کے لئے بھلائی ہے اور جس نے برا کام کیا اس کے لئے برائی
ہے اور کسی مخصوص نسل یا شخص کی خاطر فطرت کا یہ قانون بدل نہیں سکتا۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ
إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً ط قُلْ
أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا
فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ
أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا
تَعْلَمُونَ ۝ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ
سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ
خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا
الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

(۲ : ۸۱)

اور ان لوگوں نے (یعنی یہودیوں نے) کہا
ہمیں جہنم کی آگ کبھی چھونے والی نہیں اور
اگر چھوئے بھی تو اس سے زیادہ نہیں کہ چند
دنوں کے لئے چھوئے (اے پیغمبر) ان سے
کہو یہ جو تم کہتے ہو تو کیا تم نے خدا سے
کوئی قول و قرار کرلیا ہے اور وہ اب اپنے
قول و قرار سے پھر نہیں سکتا یا پھر تم خدا کے
نام سے ایک ایسی (جھوٹی) بات کہہ رہے
ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں؟ نہیں (خدا
کا قانون تو یہ ہے کہ کسی نسل اور کسی گروہ
کا انسان ہو لیکن) جس کسی نے برائی کمائی
اور اپنے گناہوں میں گھر گیا تو وہ دوزخی
گروہ میں سے ہے ہمیشہ دوزخ میں رہنے
والا اور جس کسی نے بھی ایمان کی راہ
اختیار کی اور نیک عمل ہوا تو وہ بہشتی گروہ
میں سے ہے ہمیشہ بہشت میں رہنے والا

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ

(مسلمانو! یاد رکھو نجات اور سعادت) نہ تو

اَهۡلِ الۡكِتٰبِ ؕ مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا يُّجۡزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدۡ لَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيۡرًا ۝ (۴ : ۱۲۳)

تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر خدا کا قانون تو یہ ہے جو کوئی بھی برائی کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سامنے آئے گا اور پھر نہ تو کسی کی دوستی بچا سکے گی نہ کسی طاقت کی مددگاری۔

اسی گروہ بندی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ یہودی سمجھتے تھے کہ کاروبار کی انجام دہی میں سچائی اور دیانتداری کے جتنے بھی احکام ان کے لئے نازل ہوئے ہیں غیر یہودیوں کے ساتھ معاملت کرتے وقت ان کی پابندی ضروری نہیں انہوں نے یہ خیال قائم کر لیا تھا کہ جو آدمی ہمارا ہم مذہب نہیں ہے تو ہمارے لئے روا ہے کہ جس طرح بھی چاہیں اس کے مال وجائداد کو ہضم کر لیں ، چنانچہ لین دین میں سود لینے کی ممانعت کو انہوں نے صرف اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا۔ دوسروں کے ساتھ اس اصول کو ملحوظ رکھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے ، رسول اللہ صلعم کے زمانے میں جو یہودی عرب میں آباد تھے وہ عربوں کے ساتھ اسی قسم کا طرز عمل رکھتے تھے وہ کہتے تھے کہ عرب کے باشندے ان پڑھ اور بت پرست ہیں ہم ان لوگوں کا مال جس طرح بھی کھا لیں ہمارے لئے جائز ہے :۔

وَّاَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ (۴ : ۱۶۱)

اور ان کا سود کھانا حالانکہ وہ اس سے روک دیئے گئے تھے اور ان کی یہ بات کہ لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھا لیتے تھے

ذَالِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

(۳ : ۷۰)

(یہودیوں کی) یہ (بدمعاملگی) اس لئے ہے کہ وہ کہتے ہیں (عرب کے ان ان پڑھ لوگوں سے (بدمعاملگی کرنے میں ہم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی (جس طرح بھی ہم چاہیں ان کا مال کھا سکتے ہیں حالانکہ) ایسا کہتے ہوئے وہ صریح اللہ پر افترا کرتے ہیں ہاں (ان سے باز پرس ہو اور ضرور ہو کیونکہ اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ) جو کوئی اپنا قول و قرار سچائی کے ساتھ پورا کرتا ہے اور برائی سے بچتا ہے تو وہی اللہ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے اور اللہ برائی سے بچنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

ایسا عقیدہ رکھنا خدا کے دین پر صریح افترا تھا خدا کا دین تو یہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ نیکی کرنی چاہیئے اور ہر ایک کے ساتھ معاملہ کرنے میں راست بازی اور دیانت داری کو ملحوظ رکھنا چاہئے اس کا تعلق کسی عقیدہ یا گروہ سے کیوں نہ ہو۔

مذہبی گروہ بندیوں نے جن رسموں کو جنم دیا ہے ان میں سے ایک رسم وہ ہے جسے اصطباغ (بپتسما) کہتے ہیں یہ دراصل ایک یہودی رسم تھی جو اس وقت ادا کی جاتی تھی جب کوئی گناہوں کا اعتراف

اور ان سے توبہ کرنا تھا۔ لیکن عیسائیوں نے اسے ایک ذریعہ نجات بنا دیا۔ قرآن اسے گمراہی بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ محض ایک مقررہ رسم ادا کر دینے سے نجات و سعادت حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ نجات و سعادت حاصل ہوتی ہے نیک عملی سے۔ قرآن کہتا ہے کہ صرف پانی چھوا دینے سے اصطباغ نہیں ہوتا بلکہ اصطباغ یہ ہے کہ تمہارے دل خدا پرستی کے رنگ میں رنگ جائیں۔ قرآن کہتا ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ج وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ز وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ٥ (۲: ۱۳۸)

یہ اللہ کا رنگ ہے (یعنی دین الٰہی کا قدرتی اصطباغ ہے) اور اللہ سے بہتر رنگ دینے میں اور کون ہو سکتا ہے؟ ہم تو اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ یہودیوں اور عیسائیوں کا مذہب ایک ہی تھا اور کتاب الٰہی یعنی تورات دونوں کی مشترکہ میراث تھی لیکن دو مذہبی گروہوں میں بٹ جانے کی وجہ سے وہ باہمدگر مخالف اور مکذب ہو گئے تھے ایک دوسرے کو جھٹلاتے اور ہر جتھا صرف اپنے ہی جتھے کے لوگوں کو نجات و سعادت کا مالک سمجھتا تھا۔

جب دنیا اتنے گروہوں اور جتھوں میں بٹ گئی تھی اور ہر جتھا دوسرے جتھے کے مذہب کو جھٹلا رہا تھا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ان سب کی اصل ایک ہی تھی تو یہ فیصلہ کون کرتا کہ سچائی کا حقیقی نمائندہ کون ہے؟ قرآن کہتا ہے سچائی اصلاً سب کے پاس ہے مگر عملاً سب نے اسے کھو دیا ہے۔ سب کو

ایک ہی دین دیا گیا تھا اور سب کے لئے ایک ہی عالمگیر قانون ہدایت تھا لیکن سب نے اصل حقیقت ضائع کر دی اور "دین" یا راہ راست پر قائم رہنے کی جگہ ہر گروہ نے الگ الگ راستے اختیار کر لئے اور یہ سمجھ بیٹھا کہ سعادت و نجات کا وہی مستحق ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہدایت کا راستہ سب کے لئے کھلا ہے اور کسی خاص نسل یا قوم کے لئے مختص نہیں ہے۔

باب ششم

وحدت انسان

جن لوگوں نے خدا کے نام پر اپنے آپ کو الگ الگ مذہبی گروہوں میں بانٹ لیا تھا ان کے بارے میں قرآن کا یہ انتباہ تھا کہ "کیا اپنے پروردگار سامنے وہ تم سے جھگڑتے رہیں گے؟"

اگر خدا پر سچے دل سے ایمان لایا جائے تو عمل کی زندگی میں یہ ایمان انسانی اخوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی قرآن کا پیام تھا اور اسی نے یہودیوں، عیسائیوں اور پیغمبرؐ کے زمانے کے عرب مشرکین کو یہی پیام دیا تھا اس کی اصل تبلیغ یہ تھی کہ سارے گروہ اور مذہبی جھگڑے پھر ایک جگہ آجائیں اور بنی نوع انسان کی عظیم تر اخوت کا راستہ ہموار کریں۔ مولانا آزادؔ نے قرآن کے مطالعہ سے اسی پیام کا استخراج فرمایا ہے۔

قرآن نے اخوتِ انسانی کا جو لائحہ عمل دیا ہے اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ ابتدا میں نوع انسانی ایک ہی جمعیت تھی جو سارے انسانوں کے ایک خدا پر ایمان رکھتی تھی اور اسی ایمان کے مطابق شروع میں تمام انسانوں نے دین یا زندگی کا ایک ہی راستہ اختیار کیا تھا۔ سابقہ باب میں بتایا گیا ہے کہ کس شدت کے ساتھ قرآن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ زندگی کی یہ راہ سب کے لئے ایک ہی

ہو سکتی ہے اور اسی اصول کے تحت اس زمانے کے یہودیوں، عیسائیوں اور عربوں کو مخاطب کیا ہے۔ ان سب میں یہ بات قدرِ مشترک تھی کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کو اپنے مشترکہ مورثِ اعلیٰ کا مرتبہ دیتے تھے اور یکساں طور پر ان کا احترام کرتے تھے پس قرآن ان کے سامنے ایک نہایت سیدھا سا سوال پیش کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اگر ہر ایک کے دین کی سچائی اس کے اپنے گروہ کے ساتھ وابستہ ہے تو بتلاؤ کہ یہ سب کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کس گروہ کے آدمی تھے۔ ان کے زمانے میں نہ تو یہودیت کا ظہور ہوا تھا، اور نہ مسیحیت کا۔ تو پھر ان کا کون سا راستہ یا دین تھا؟

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۳ : ۵۸)

اے اہلِ کتاب تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو حالانکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ تورات اور انجیل نازل نہیں ہوئیں مگر اس کے بعد پھر اتنی صاف بات بھی سمجھ نہیں سکتے۔

أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي ۖ قَالُوا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ إِلٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (۲ : ۱۲۷)

پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کے سامنے موت آ کھڑی ہوئی تھی اور اس نے اپنی اولاد سے پوچھا تھا، بتلاؤ میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ انہوں نے جواب میں کہا تھا اسی ایک خدا کی عبادت کریں گے جس کی تو نے عبادت کی ہے اور تیرے بزرگوں ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ نے کی ہے اور ہم خدا کے حکموں کے فرمانبردار ہیں۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارٰى

اور یہودی کہتے ہیں یہودی ہو جاؤ ہدایت پاؤ گے

اپنی خاص احتیاج رکھتے ہیں لیکن خاص افراد بحیثیت فرد کے اپنی طلب واستعداد کا الگ الگ درجہ و مقام رکھتے ہیں اور ان کے لئے عرفان و یقین کی راہیں کھلی چھوڑ دی گئی ہیں۔

صحیح بخاری اور مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث ہے جو نہایت جامع اور مانع الفاظ میں اس فرق مراتب کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ حدیث تین مرتبوں کا ذکر کرتی ہے۔ اسلام، ایمان اور احسان۔ اسلام یہ ہے کہ اسلامی عقیدہ کا اقرار کرنا اور عمل کے چاروں ارکان یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو انجام دینا ایمان یہ ہے کہ اقرار کے مرتبہ سے آگے بڑھنا اور اسلام کے بنیادی عقائد کے حق الیقین کا مرتبہ حاصل کرنا اور احسان یہ ہے کہ:۔

اِنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ	تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے گویا
فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ	اسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے
يَرَاكَ (صحیحین)	نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے

پہلا مرتبہ اسلامی دائرہ کے عام اعتقاد و عمل کا ہے یعنی جس نے اسلامی عقیدہ کا اقرار کر لیا اور اس کے اعمال کی زندگی اختیار کر لی وہ اس دائرہ میں آگیا لیکن محض دائرۂ اسلام میں داخل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ علم الیقین کے مقامات بھی حاصل ہو گئے۔

پہلا مرتبہ صرف اس کے خارجی اور ابتدائی پہلو کا مظہر ہوتا ہے دوسرا مرتبہ ایمان کا ہے۔ یہ انسان کے دل و دماغ کا یقین و اذعان ہے۔ یہ مرتبہ جس نے حاصل کر لیا وہ خواص کے زمرہ میں داخل ہو گیا لیکن معاملہ

اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ عرفانِ حقیقت اور عین الیقین ایقان کا ایک اور مرتبہ اس کے بعد آتا ہے جسے احسان سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن یہ مقام محض اعتقاد اور یقین پیدا کر لینے کا نہیں ہے جو ایک جماعت یا گروہ کو بحیثیت جماعت یا گروہ کے حاصل ہو جا سکتا ہے۔ یہ مقام ذاتی تجربہ و کشف سے حاصل ہوتا ہے محض تعلیمی عقائد یا فکری قیاسات سے اس مرتبہ تک رسائی نہیں ہوتی۔ یہ سیکھنے اور بتلانے کا معاملہ نہیں، ذاتی تجربہ مختلف کا معاملہ ہے، جو یہاں تک پہنچ گیا وہ اگر کچھ بتلائے گا تو بھی یہی بتلائے گا کہ میری طرح بن جاؤ پھر جو کچھ دکھائی دیتا ہے دیکھ لو۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست — گفتم کہ چو من شوی بدانی

اسلام نے اس طرح طلب و جہد کی روحانی پیاس کے لئے درجہ بدرجہ سیرابی کا سامان مہیا کر دیا۔ عام آدمی کے لئے پہلا مرتبہ ہے زیادہ ترقی یافتہ انسان کے لئے دوسرا مرتبہ اور خاصان خاص کے لئے تیسرا مرتبہ ہر چند کہ ہر ایک کے لئے جام الگ الگ ہیں لیکن پیاس بجھانے کے واسطے میخانہ ایک ہی ہے۔ ہر ایک کے حصہ میں اس کے ظرف کے مطابق ایک جام آجاتا ہے۔

ساقی بہ ہمہ بادہ زیک خم دہد اما — در مجلس او مستی ہر کس ز شرابے ست

یہاں اس امر کی جانب اشارہ کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ علمائے اسلام خصوصاً صوفیائے کرام نے خدا کے بارے میں ایک تصور قائم کیا ہے جو عام طور سے نظریہ وحدت الوجود کہلاتا ہے۔ توحید وجودی کے قائل قرآنِ

کی مختلف آیات سے اس نظریہ پر استدلال لاتے ہیں. مثلاً
"هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ" "اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" اور "وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ" اور "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ" وغیرہ وغیرہ

دہلی کے مشہور محدث شاہ ولی اللہ نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اگر میں مسئلہ وحدت الوجود کو ثابت کرنا چاہوں تو قرآن وحدیث کے تمام نصوص و ظواہر سے اس کا اثبات کر سکتا ہوں"۔ لیکن مولانا آزاد متنبہ کرتے ہیں کہ "اس بارے میں صاف بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ ان تمام تصریحات کو ان کے فہمی محامل سے دور نہیں لے جانا چاہیے اور ان معانی سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے جو صدر اول کے مسلمانوں نے سمجھے تھے. باقی رہا حقیقت کے کشف وعرفان کا وہ مقام جو عرفا طریق کو پیش آتا ہے تو وہ کسی طرح قرآن کے تصور الٰہی کے عقیدے کے خلاف نہیں. قرآن کا تصور الٰہی ایک جامع تصور ہے اور ہر توحیدی تصور کی اس میں گنجائش ہے. جو افراد خاصہ مقام احسان تک رسائی حاصل کرتے ہیں وہ حقیقت کو اس کی پس پردہ جلوہ طرازیوں میں بھی دیکھ لیتے ہیں اور عرفان کا وہ منتہی مرتبہ جو فکر انسانی کے دسترس میں ہے انہیں حاصل ہوتا ہے"۔

۔۔۔۔۔

باب دوم

صفت ربوبیت

صفاتِ الٰہی کے ذکر میں مولانا آزاد ایک عام جائزہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کائنات کے نظام ہستی میں وحدتِ وجود کا جلوہ وحدت صفات کی شکل میں دکھائی دیتا ہے یعنی صفاتِ الٰہی کا الگ الگ اظہار نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ظاہر ہوتی ہیں تاکہ زندگی میں ہم آہنگی کا جلوہ نظر آئے سورۂ فاتحہ یا قرآن کے افتتاحی باب میں خدا کی چند بنیادی صفات کا ذکر کیا گیا ہے جیسے ربوبیت، رحمت، عدالت اور ہدایت کی صفات. مولانا آزاد اپنی تفسیر میں بالترتیب ان صفات پر روشنی ڈالتے ہیں اور پورے قرآن سے ان کی جلوہ نمائی کے ثبوت بہم پہنچاتے ہیں. سب سے پہلے وہ خدا کی اولین صفت یعنی ربوبیت کا ذکر کرتے ہیں جو قرآن کی توجہ کا مرکز ہے.

ربوبیت کی اصطلاح رب سے نکلی ہے جو سامی زبانوں کے کئی الفاظ کا مشترک مادہ ہے. عبرانی، عربی اور سریانی تینوں زبانوں میں رب کے معنی پالنے والے کے ہیں یا ایسی ہستی کے جو اسباب پرورش مہیا کرتی ہے چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے اس لئے رب کے لفظ کو جو معنی عطا کئے گئے گویا وہ خدا کے تصور کا پہلا

قدرتی زینہ تھے جس کے بارے میں ابتدائی سامی ذہن نقش آرائی کر سکتا تھا رب کے معنی معلم، آقا یا خدا کے بھی ہیں۔ قرآنی زبان میں اس لفظ کو اس کے وسیع اور کامل معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اسی لئے بعض علمائے لغت نے ربوبیت کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے ھُوَ اِنشَاءُ الشَّیْءِ حَالاً فَحَالاً اِلیٰ حَدِّ التَّمَامِ۔ یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ اپنی حد کمال تک پہنچ جائے۔ یعنی ربوبیت کے لئے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود کو اس کی تکمیل و بلوغ کے لئے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں ان سب کا سروسامان ہوتا رہے۔ لیکن قرآنی تصور کے لحاظ سے مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ ربوبیت میں محبت و شفقت کا لگاؤ ضروری ہے۔ ایک تمثیل کے ذریعہ ان معنوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

" بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے زندگی اور نمو کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے سب کی سب پرورش و تربیت کی محتاج ہوتی ہیں، یہ پرورش محبت و شفقت، حفاظت و نگہداشت اور بخشش و اعانت کا ایک طول طویل سلسلہ ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک بچہ اپنے جسم و ذہن کے حد بلوغ تک نہ پہنچ جائے، پھر پرورش کی ضرورتیں ایک دو نہیں بے شمار ہیں۔ ان کی نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور ضروری ہے کہ ہر عمر اور ہر حالت کے مطابق محبت کا جوش، نگرانی کی نگاہ

اور نگرانی کا سر و سامان ملتا رہے، حکمت الٰہی نے ماں کی محبت میں ربوبیت کے یہ تمام خدوخال پیدا کر دیے ہیں، یہ ماں کی ربوبیت ہی ہے جو پیدائش کے دن سے لے کر بلوغ تک بچہ کو پالتی، بچاتی، سنبھالتی اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق اس کی ضروریات پرورش کا سر و سامان مہیا کرتی رہتی ہے۔ جب بچہ کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہیں ہو سکتا تو اسے دودھ ہی پلایا جاتا ہے جب دودھ سے قوی غذا کی ضرورت ہوتی ہے تو ویسی ہی غذا دی جانے لگتی ہے۔ جب بچہ میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت نہیں ہوتی تو ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی ہے۔ جب وہ کھڑے ہونے کے قابل ہو جاتا ہے تو ماں اس کی انگلی پکڑ کر اسے ایک ایک قدم چلاتی ہے۔ پس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیا ہوتی رہیں، اور نگرانی و حفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہے وہ صورت حال ہے جس سے ربوبیت کے مفہوم کا تصور کیا جا سکتا ہے،، قرآن نے رب کی حیثیت سے خدا کا جو تصور پیش کیا ہے اس تمثیل کی روشنی میں آسانی سے اسے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے خدا کے ساتھ رب العالمین کی صفت کو وابستہ کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کسی خاص قوم یا گروہ کا رب پالنے والا نہیں ہے بلکہ بنی نوع انسان اور کائنات ہستی کی تمام مخلوقات کا رب ہے۔

نظام ربوبیت

مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں کہ ربوبیت الٰہی کا عمل ایک معینہ نظام کے تحت ہے، ہر وجود کو ہر حالت میں زندگی اور بقا کے لئے جو کچھ مطلوب تھا۔ وہ سب کچھ مل رہا ہے، چیونٹی زمین پر

رینگ رہی ہے، کیڑے مکوڑے، کوڑے کرکٹ میں اپنا راستہ پیدا کر لیتے ہیں۔ مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں، پرند ہوا میں اڑ رہے ہیں، پھول باغوں میں کھل رہے ہیں، ہاتھی جنگل میں گھوم رہے ہیں، اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں۔ لیکن فطرت کے پاس یکساں طور پر سب کے لئے پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضانِ ربوبیت سے محروم ہو۔ مخلوقات کی بے شمار قسمیں ایسی بھی ہیں جو اتنی حقیر اور بے مقدار ہیں کہ ہماری آنکھ انہیں دیکھ بھی نہیں سکتی لیکن ربوبیت الٰہی نے جس طرح اور جس نظام کے ساتھ ہاتھی جیسی جسیم مخلوق کے لئے سامان پرورش و نگہداشت مہیا کر دیا ہے ٹھیک اسی طرح اور ویسے ہی نظام کے سا[illegible] ان کے لیے بھی زندگی اور بقا کی ہر چیز مہیا کر دی اور یہ کچھ ہے انسان کے وجود [illegible] ہر ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کو دیکھے تو خود اس کی زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ربوبیت الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (۵۱: ۲۰: ۲۱)	ان لوگوں کے لئے جو (سچائی پر) یقین رکھنے والے ہیں زمین میں (خدا کی کارفرمائیوں کی کتنی بڑی) نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی۔ پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

خارجی پہلو سامانِ زندگی کی بخشائش اور ربوبیت کے عمل میں جو فرق ہے قرآن اس فرق کو واضح کرتا ہے۔ دنیا میں ایسے عناصر، ایسی قوتیں اور ان کی ایسی مختلف شکلیں اور بناوٹیں موجود ہیں جو زندگی

کی ترقی اور نشوونما کے لئے سودمند ہیں لیکن محض ان کی موجودگی ربوبیت سے تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ ایسا ہونا قدرت الٰہی کی رحمت ہے مگر وہ بات نہیں جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت یہ ہے کہ ان اشیاء کی بخشش و تقسیم کا بھی ایک نظام موجود ہے۔ مثلاً زندگی کے لئے پانی اور رطوبت کی ضرورت ہے لیکن پانی کی موجودگی بجائے خود زندگی کے لئے کافی نہیں جب تک کہ ایک مقررہ مقدار اور ایک خاص وقت و انتظام کے ساتھ پانی موجود نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اللہ کی رحمت ہے جس نے پانی جیسا جوہر حیات پیدا کر دیا لیکن یہ اس کی ربوبیت ہے جو پانی کو ایک ایک بوند کر کے ٹپکاتی۔ زمین کے گوشے گوشے تک پہنچاتی، ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی، ایک خاص موسم اور محل میں برساتی اور پھر زمین کے ایک ایک تشنہ ذرے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سیراب کر دیتی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْکَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰی ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ فَاَنْشَاْنَا لَکُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَکُمْ فِیْهَا فَوَاکِهُ کَثِیْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْکُلُوْنَ

(۲۳ : ۱۸ ، ۱۹)

اور (دیکھو) ہم نے آسمان سے ایک خاص اندازے کے ساتھ پانی برسایا پھر اسے زمین میں ٹھیرائے رکھا اور ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ جس طرح برسایا تھا اسی طرح اسے واپس لے جائیں، پھر دیکھو اسی پانی سے ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کر دیئے جن میں بے شمار پھل لگتے ہیں اور ان میں سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو۔

قرآن نے جابجا اشیاء کی قدر اور مقدار کا ذکر کیا ہے یعنی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فطرت کائنات جو کچھ بخشتی ہے ایک خاص اندازہ کے ساتھ بخشتی ہے اور یہ اندازہ ایک خاص نظام کے تحت ہوتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۲۱:۱۵)

اور کوئی شے نہیں جس کے ہمارے پاس ذخیرے موجود نہ ہوں (لیکن ہمارا طریق کار یہ ہے کہ) جو کچھ نازل کرتے ہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں

وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ (۱۳:۸)

اور اللہ کے نزدیک ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے۔

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۵۴:۴۹)

ہم نے جتنی چیزیں بھی پیدا کی ہیں ایک اندازہ کے ساتھ پیدا کی ہیں۔

غور کیجئے! دنیا میں صرف یہی نہیں ہے کہ پانی موجود ہے بلکہ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ موجود ہے یہ کیوں ہے کہ پہلے سورج کی شعاعیں سمندر سے ڈول بھر بھر کو فضا میں پانی کی چادریں بچھا دیں پھر ہواؤں کے جھونکے انہیں حرکت میں لائیں اور پانی کی بوندیں بنا کر ایک خاص وقت اور خاص محل میں برسائیں۔ پھر یہ کیوں ہے کہ جب کبھی پانی برسے تو ایک خاص ترتیب اور مقدار ہی سے برسے اور اس طرح برسے کہ زمین کی بالائی سطح پر اس کی ایک خاص مقدار بہنے لگے اور ایک خاص مقدار زمین کے اندرونی حصوں میں جذب ہو جائے، کیوں ایسا ہوتا ہے کہ پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے

تودے جمتے ہیں اور پھر موسم کی تبدیلی سے پگھلنے لگتے ہیں، پھر ان کے پگھلنے سے پانی کے سرچشمے ابلنے لگتے ہیں۔ پھر چشموں سے دریا کی جدولیں بہنے لگتی ہیں۔ پھر یہ جدولیں پیچ و خم کھاتی ہوئی دور دور تک دوڑ جاتی ہیں اور سینکڑوں ہزاروں میلوں تک زمین کو سیراب کر دیتی ہیں؟

کیوں یہ سب کچھ ایسا ہی ہوا، کیوں کسی دوسرے انداز سے نہ ہوا؟ قرآن اس کا جواب دیتا ہے۔ اس لئے کہ کائنات ہستی میں ربوبیت الٰہی کارفرما ہے اور ربوبیت کا مقتضیٰ یہی تھا کہ پانی اسی ترتیب سے بنے اور اسی ترتیب و مقدار سے تقسیم ہو۔ یہ رحمت و حکمت تھی جس نے پانی پیدا کیا لیکن یہ ربوبیت ہے جو اسے اس طرح کام میں لائی کہ ہر مخلوق کی پرورش اور رکھوالی کی ضرورتیں پوری ہو گئیں۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ کَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ کِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۰ : ۴۸)

اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ پہلے ہوائیں چلتی ہیں پھر ہوائیں بادلوں کو چھیڑ کر حرکت میں لاتی ہیں۔ پھر وہ جس طرح چاہتا ہے انہیں فضا میں پھیلا دیتا ہے اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ بادلوں میں سے مینہ نکل رہا ہے۔ پھر جن لوگوں کو بارش کی یہ برکت ملنی تھی مل چکی ہے تو اچانک خوش وقت ہو جاتے ہیں۔

زندگی کے لئے جن چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی انہی کی بخشائش سب سے زیادہ اور عام ہے اور اسی طرح جن کی ضرورت خاص خاص حالتوں میں یا خاص خاص موقعوں کے لئے تھی ان میں اختصاص اور مقابیت پائی جاتی ہے، ہوا سب سے زیادہ ضروری تھی کیونکہ پانی اور غذا کے بغیر کچھ عرصہ تک زندگی ممکن ہے مگر ہوا کے بغیر ممکن نہیں پس اس کا سامان اتنا وافر اور عام ہے کہ زمین کا کوئی گوشہ نہیں جو کسی وقت بھی اس سے خالی ہو، ہوا کے بعد دوسرے درجہ پر پانی ہے اس لئے اس کی بخشائش کی فراوانی اور عمومیت کا درجہ ہوا کے بعد ہے، دنیا کے ہر حصہ میں زمین کے اوپر ہر طرف دریا رواں ہیں اور زمین کے نیچے بھی پانی کے سوتے بہہ رہے ہیں پھر ان دونوں ذخیروں کے علاوہ فضائے آسمانی کا بھی کارخانہ ہے جو شب و روز سرگرم کار رہتا ہے، وہ سمندر کا شورابہ کھینچتا ہے اسے صاف و شیریں بنا کر جمع کرتا رہتا ہے پھر حسب ضرورت زمین کے حوالے کر دیتا ہے ہوا اور پانی کے بعد غذا کی ضرورت تھی لہذا ہوا اور پانی سے کم مگر اور تمام چیزوں سے زیادہ اس کا دستر خوانِ کرم پورے کرۂ ارض پر بچھا ہوا ہے۔ اور کوئی مخلوق نہیں جس کے گرد و پیش اس کی غذا کا ذخیرہ موجود نہ ہو۔

پھر سامان پرورش کے اس عالمگیر نظام پر غور کرو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام کارخانہ صرف اس لئے بنا ہے کہ زندگی بخشے اور زندگی کی ہر استعداد کی رکھوالی کرے، سورج اس لئے ہے کہ روشنی کے لئے چراغ

اور گرمی کے لئے تنور کا کام دے اور اپنی کرنوں کے ڈول بھر بھر کر سمندر سے پانی کھینچتا رہے۔ ہوائیں اس لئے ہیں کہ اپنی سردی اور گرمی سے مطلوبہ اثرات پیدا کرتی رہیں، کبھی پانی کے ذرات جما کر ابر کی چادریں بنا دیں اور کبھی ابر کو پانی بنا کر برسا دیں۔ زمین اس لئے ہے کہ نشو و نما کے خزانوں سے ہمیشہ معمور رہے اور ہر دانے کے لئے اپنی گود میں زندگی اور ہر پودے کے لئے اپنے سینے میں پرورد گی رکھے۔ مختصر یہ کہ کارخانہ ہستی کا ہر گوشہ صرف اسی کام میں لگا ہوا ہے، ہر قوت اپنی استعداد کا مظاہرہ کر رہی ہے اور ہر علت اپنی تاثیر کے اظہار میں لگی ہوئی ہے جوں ہی کسی وجود میں بڑھنے اور نشو و نما پانے کی استعداد پیدا ہوتی ہے معاً تمام کارخانہ ہستی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، سورج کی تمام کارفرمائیاں فضا کے تمام تغیرات زمین کی تمام قوتیں اور عناصر کی تمام سرگرمیاں صرف اسی انتظار میں رہتی ہیں کہ کب چیونٹی کے انڈے سے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اور کب دہقان کی جھولی سے ایک دانہ زمین پر گرتا ہے۔

لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵ : ۱۳)

اور آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے سب کو اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا، بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس بات میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب مگر سب سے زیادہ

نمایاں حقیقت نظام ربوبیت کی یکسانیت اور ہم آہنگی ہے یعنی ہر وجود کی پرورش کا سروسامان جس طرح اور جس اسلوب پر کیا گیا ہے وہ ہر گوشے میں ایک ہی ہے اور ایک ہی اصل و قاعدہ رکھتا ہے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا گلاب کے شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے لیکن دونوں کو ایک ہی طریقہ سے سامان پرورش ملا ہے اور دونوں ایک ہی طرح سے پایۂ پرورش پا رہے ہیں۔ ایک انسان کا بچہ اور درخت کا ایک پودا بظاہر دو الگ الگ حیثیتوں کے مظہر دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی نشو و نما کے طریقوں کا کھوج لگانے سے پتہ چلتا ہے کہ قانونِ پرورش کی یکسانیت نے دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا ہے۔ پتھر کی چٹان ہو یا پھول کی کلی، انسان کا بچہ ہو یا چیونٹی کا انڈا سب کے لئے پیدائش کا وقت مقرر ہے اور قبل اس کے کہ پیدائش ظہور میں آئے سامانِ پرورش مہیا ہو جاتا ہے پھر یکے بعد دیگرے طفولیت، رشد و بلوغ، شباب، سن کمال اور بالآخر ضعف و انحطاط کی منزلیں آتی ہیں۔ زندگی کے ظہور، نشو و نما اور زوال و انحطاط کا افسوں سب کے لئے یکساں ہے:۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ (۳۰ : ۵۴)	یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا ہے کہ پہلے ناتوانی کی حالت ہوتی ہے پھر ناتوانی کے بعد توانائی آتی ہے پھر توانائی کے بعد دوبارہ ناتوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے

وہ علم اور قدرت رکھنے والا ہے

الم تر ان اللہ انزل من
السماء ماء فسلکہ ینابیع
فی الارض ثم یخرج بہ
زرعا مختلفا الوانہ ثم یہیج
فتراہ مصفرا ثم یجعلہ
حطاما ان فی ذالک لذکری
لاولی الالباب ٥ (۲۱:۳۹)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے
پانی برسایا زمین میں اس کے چشمے رواں
ہوگئے، پھر اسی پانی سے رنگ برنگ کی کھیتیاں
لہلہا اٹھیں پھر ان کی نشو ونما میں ترقی
ہوئی اور پوری طرح پک کر تیار ہوگئیں
پھر ترقی کے بعد زوال طاری ہوا اور
تم دیکھتے ہو کہ ان پر زردی چھاگئی بالآخر
خشک ہوکر چورچور ہوگئیں۔ بلاشبہ
دانشمندوں کے لئے اس صورت حال
میں بڑی ہی عبرت ہے۔

جہاں تک غذا کا تعلق ہے، حیوانات میں ایک قسم ان جانوروں کی ہے جن کے بچے دودھ سے پرورش پاتے ہیں اور ایک ان کی ہے جو عام غذاؤں سے پرورش پاتے ہیں۔ غور کرو نظام ربوبیت نے دونوں کے پرورش کے لئے کیسا عجیب سروسامان مہیا کردیا ہے۔ انسان کو لے لو، جوں ہی وہ پیدا ہوتا ہے اس کی غذا اپنی ساری خاصیتوں اور مناسبتوں کے ساتھ خود بخود مہیا ہو جاتی ہے اور ایسی جگہ مہیا ہوتی ہے جو اس کے لئے سب سے قریب اور موزوں ہوتی ہے، ماں اپنے نومولود بچے کو جوش محبت میں سینے سے لگا لیتی ہے اور وہیں اس کی غذا کا سرچشمہ بھی وجود ہوتا ہے۔ پھر دیکھو! اس غذا کی نوعیت اور

مزاج میں اس کی حالت کا درجہ بدرجہ کس قدر لحاظ رکھا گیا ہے اور کس طرح یکے بعد دیگرے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ابتدا میں بچہ کا معدہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اسے بہت ہی ہلکے قوام کا دودھ ملنا چاہیئے چنانچہ نہ صرف انسان میں بلکہ تمام حیوانات میں ماں کا دودھ بہت ہی پتلے قوام کا ہوتا ہے لیکن جوں جوں بچے کی عمر اور معدہ قوی ہوتا جاتا ہے دودھ کا قوام بھی بدلتا جاتا ہے یہاں تک کہ بچے کا عہد رضاعت پورا ہو جاتا ہے اور اس کا معدہ عام غذاؤں کے ہضم کرنے کی استعداد پیدا کر لیتا ہے اور اس منزل پر ماں کا دودھ خشک ہونا شروع ہو جاتا ہے، یہ گویا ربوبیت الٰہی کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب اس کے لئے دودھ کی ضرورت نہیں رہی بلکہ وہ ہر طرح کی غذا استعمال کر سکتا ہے۔

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (۴۶ : ۱۵)

اس کی ماں نے اسے تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت (کم از کم) تیس مہینوں کی ہے۔

پھر دیکھو! کارساز فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے، محبت مادری کا یہ شعلہ خود بخود دھیما پڑتا جاتا ہے یہ محبت مادری ہے جو ماں کے دل میں شریف ترین جذبات کو نشوونما دیتی ہے اور اپنے بچے کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی سے کبھی دریغ نہیں کرتی پھر جوں جوں بچہ بڑھتا جاتا ہے محبت مادری کے جذبہ کی شدت کم ہوتی جاتی ہے

اور پھر ایک وقت آتا ہے جبکہ یہ جذبہ حیوانات میں تو بالکل باقی نہیں رہتا لیکن انسان میں بھی اس کی گرمجوشیاں باقی نہیں رہتیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی محبت کا ایک عظیم ترین جذبہ ماں کے دل میں موجزن ہو جائے اور پھر ایک خاص وقت تک قائم رہ کر رفتہ رفتہ غائب ہو جائے؟ اس لئے کہ نظام ربوبیت کی کارفرمائی ہے اور اس کا مقتضیٰ یہی تھا ربوبیت چاہتی ہے کہ جب تک بچہ کو پرورش کی احتیاج باقی رہے اس کی پرورش ہو اس لئے ماں کی محبت میں بھی بچے کی پرورش کا جوش اتنا ہی زیادہ تھا جب بچے کی عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ ماں کی پرورش کی احتیاج باقی نہ رہی تو اس جذبہ کی ضرورت بھی باقی نہ رہی، اب اس کا باقی رہنا ماں کے لئے بوجھ اور بچے کی نشوونما کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے، بچے کی احتیاج کا سب سے نازک وقت اس کی ننھی ننھی طفولیت تھی اس لئے ماں کی محبت میں بھی سب سے زیادہ جوش اسی وقت تھا، پھر جوں جوں بچہ بڑھتا گیا یہ احتیاج کم ہوتی گئی بلاشبہ ماں کی محبت اپنے بچے کے لئے ہمیشہ زندہ رہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے، لیکن اس کا محض ایک سماجی قدر ہوتی ہے بچے کی طفولیت کے عہد میں محبت مادری کا جو فطری اور جبلی جوش ہوتا ہے وہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

انسان اور حیوانات کے بچوں کی پرورش میں ضرور تھوڑا سا فرق ہوتا ہے، مثلاً جب انڈے سے مرغی کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی جسمانی ساخت اور طبیعت دودھ پینے والے بچوں سے مختلف ہوتی ہے وہ اول دن سے ہی معمولی اور عام غذائیں کھا سکتے ہیں بشرطیکہ کھلانے کے لئے کوئی شفیق

فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۶ : ۱۵۵)

پس اسی ایک راہ پر چلو. طرح طرح کی راہوں کے پیچھے نہ پڑجاؤ کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے منتشر جدا جدا کردیں گی یہی بات ہے جس کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم (نافرمانی سے) بچو

قرآن سے بنائے نزاع

اس بات کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے مولانا آزاد اس نزاع کی نوعیت بیان کرتے ہیں جو پیغمبر اسلام کے زمانے میں قرآن اور اس کے ان مخالفین میں پیدا ہوگئی تھی جو ان دوسرے مذاہب کے پیرو تھے جو عرب میں جاری تھے. ان میں سے بعضوں کے پاس آسمانی صحائف بھی تھے. تو سوال یہ ہے کہ کیا قرآن نے ان مقدس صحیفوں سے انکار کیا تھا؟ کیا اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خدا کی سچائی کا وہی واحد علمبردار ہے اس لئے تمام لوگوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے نبیوں سے برگشتہ ہوجائیں؟ کیا اس نے کوئی ایسی نئی اور انوکھی بات پیش کی تھی جس کے ماننے میں قدرتی طور پر انہیں تامل تھا؟ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ تھی، قرآن نے نہ صرف ان تمام بانیانِ مذاہب کی تصدیق کی جن کے نام لیوا اس کے سامنے تھے بلکہ صاف صاف لفظوں میں یہ کہدیا کہ مجھ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر آچکے ہیں میں سب کی تصدیق کرتا ہوں. اس نے کسی مذہب میں کوئی فرق وامتیاز قائم نہیں کیا اور کسی مذہب کے ماننے والے سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے مذہب کی دعوت سے انکار کردے بلکہ اس کے برعکس یہی کہا کہ اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم یعنی ایک خدا پر ایمان اور نیک

عملی کی راہ پر کاربند ہو جاؤ کیونکہ تمام مذہبوں کی اصل یہی تھی۔ اس نے نہ تو کوئی نیا اصول حیات پیش کیا نہ کوئی انوکھا عمل بتایا۔ اس نے صرف انہیں باتوں پر زور دیا جو دنیا کے تمام مذاہب کی سب سے زیادہ جانی بوجھی باتیں رہی ہیں یعنی ایمان اور عمل صالح۔ اس نے جب کبھی لوگوں کو اپنی طرف بلایا تو یہی کہا کہ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقت از سر نو تازہ کر لو اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہو اور ایسا کرنا ہی گویا قرآن کے پیغام کو قبول کر لینا تھا۔

پھر آخر قرآن کی مخالفت کا سبب کیا تھا؟ قریش مکہ کی مخالفت اس بنا پر تھی کہ اس نے بت پرستی سے انکار کر دیا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ یہودیوں نے کیوں مخالفت کی جو بت پرست نہیں تھے اور عیسائی کیوں بر سر پیکار ہو گئے جنہوں نے کبھی بت پرستی کی حمایت نہیں کی تھی؟ اصل یہ ہے کہ ہر مذہب کے پیروؤں کی خواہش یہ تھی کہ قرآن اپنے حریف مذاہب کی تعلیمات کو جھٹلائے اور چونکہ اس نے ایسا نہیں کیا تھا اس لئے کوئی بھی اس سے خوش نہ تھا۔ بلاشبہ یہودی اس بات سے تو بہت خوش تھے کہ قرآن حضرت موسیٰ کی تصدیق کرتا ہے لیکن چونکہ وہ ساتھ ہی حضرت مسیحؑ کی بھی تصدیق کرتا تھا اس لئے یہودیوں نے اس کی مخالفت ضروری سمجھی۔ عیسائی اس بات پر تو خوش تھے کہ قرآن حضرت مسیحؑ کی ماں حضرت مریمؑ کی پاکی و صداقت کا اعلان کرتا ہے لیکن وہ اس سے ناراض تھے کہ قرآن یہ بھی کہتا تھا کہ نجات کا دار و مدار اعتقاد و عمل پر ہے نہ کہ کفارہ و اصطباغ پر۔ عیسائیوں کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ اسی طرح قریش مکہ کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی کہ قرآن حضرت ابراہیمؑ

اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی بزرگی کا احترام کرتا ہے کیونکہ وہ انہیں کی نسل سے تھے لیکن وہ کیونکر برداشت کر سکتے تھے کہ اسی کے ساتھ یہودی پیغمبروں کا بھی احترام کیا جائے جو ان کی نسل سے نہ تھے۔

مختصراً یوں سمجھنا چاہیئے کہ قرآن کے تین نمایاں اصول ایسے تھے جو اس وقت عرب میں مروجہ مذاہب کے پیروؤں کی ناراضگی کا باعث بنے

پہلے تو یہ کہ قرآن مذہبی گروہ بندی کا مخالف تھا۔ اس نے دین کی وحدت کا اعلان کیا۔ اگر اس بات کو مان لیا جاتا تو ان کو تسلیم کرنا پڑتا کہ دین کی سچائی کسی ایک ہی گروہ کے حصے میں نہیں آئی ہے، سب کو یکساں طور پر ملی ہے۔ لیکن اس بات کو ماننا ان کی گروہ پرستی پر شاق گزرتا تھا۔

دوسرے یہ کہ قرآن کہتا تھا نجات و سعادت کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے، نسل، قوم، گروہ بندی اور ظاہری رسم ورواج پر نہیں ہے۔ اگر اس اصول کو وہ تسلیم کر لیتے تو پھر نجات کا دروازہ بلا امتیاز تمام انسانی نسل پر کھل جاتا، لیکن اس بات کے لئے ان میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا۔

اور تیسرے یہ کہ قرآن اس بات پر زور دیتا تھا کہ اصل دین خدا پرستی ہے یعنی کسی درمیانی واسطے کے بغیر براہ راست ایک خدا کی پرستش کی جائے لیکن اس وقت کے دوسرے پیروانِ مذاہب نے خدا پرستی کے نام پر کسی نہ کسی شکل میں شرک و بت پرستی کے طریقے اختیار کر لئے تھے گو انہیں اس بات سے انکار نہ تھا کہ اصل دین بلا واسطہ خدا کی پرستش ہے، لیکن اپنے مالوف اور موروثی طریقوں سے دستبردار ہونا انہیں شاق گزرتا تھا۔

خلاصۂ بحث

نزولِ قرآن کے وقت مذہبی شعور، مختلف اقوامِ عالم کے جتھہ بندی کے شعور سے آگے نہ بڑھا تھا، ہر مذہبی گروہ اس بات کا مدعی تھا کہ صرف اسی کا مذہب سچا مذہب ہے اور جو آدمی اس کے مذہبی حلقہ میں داخل ہے وہی نجات کا مستحق ہے۔ صداقت کا معیار اور مذہب کی اصل حقیقت محض اس کے ظاہری اعمال و رسوم تھے۔ مثلاً عبادت کی شکل، قربانیوں کی رسوم کسی خاص قسم کے طعام کا کھانا یا نہ کھانا یا کسی خاص وضع قطع اور لباس کا اختیار کرنا یا نہ کرنا چونکہ یہ ظاہری اعمال و رسوم ہر مذہب میں الگ الگ تھے اس لئے ہر مذہب کا پیرو اسی بنیاد پہ دوسرے مذہبی گروہ کے پیرو کو صداقت سے خالی سمجھتا تھا۔ ہر مذہبی گروہ کا دعویٰ صرف یہی نہیں تھا کہ وہ سچائی پر ہے بلکہ یہ بھی تھا کہ دوسرے گروہ کا مذہب جھوٹا ہے، اس رویہ کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ خدا کے نام پر آپس میں نفرت و خانہ جنگی اور خونریزی کا بازار گرم رہتا تھا

قرآن نے دنیا کے سامنے تمام مذاہب کی عالمگیر وحدت کا اصول پیش کیا، اس نے کہا کہ جس طرح قوانینِ فطرت کائناتِ ہستی کے نظام کو برقرار رکھتے ہیں اسی طرح زندگی کا ایک روحانی قانون بھی ہے جو حیاتِ انسانی پر حاوی ہے اور یہ قانون سب انسانوں کے لئے یکساں ہے۔ اس نے بتایا کہ سب سے بڑی گمراہی جس میں بنی نوعِ انسانی مبتلا ہوئی تھی یہ تھا کہ اس نے اس قانونِ فطرت کو فراموش

کردیا اور الگ الگ گروہ بند یاں کرلیں۔ زندگی کے اس روحانی قانون یا دین الٰہی کا اولین مقصد یہ تھا کہ نوع انسانی کو متحد رکھے اور اس میں تفرقہ و نزاع نہ پیدا ہو، لیکن انسان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس نے اتحاد کی اس متاع گراں بہا یعنی مذہب کو تفرقہ و نفاق کا ہتھیار بنا دیا

قرآن کے ظہور کا مقصد اصل مذہب اور اس کے ظاہری شواہد میں امتیاز کرنا تھا۔ اصل مذہب کو اس نے دین سے تعبیر کیا۔ اور دوسری چیز کو شرع اور منہاج بتایا۔ دین ایک ہی ہے اور ہر زمانہ میں سب کو ایک ہی طرح سے دیا گیا ہے۔ البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف ناگزیر تھا ہر عہد اور ہر قوم کے حالات کے اعتبار سے یہ اختلافات ظاہر ہوئے پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے اور قرآن نے اسی حقیقت پر پورا زور دیا۔ قرآن کا شکوہ یہ تھا کہ دین کو فراموش کر دیا گیا ہے اور شرع و منہاج یا ظاہری شواہد کو اصل مقصد قرار دے لیا گیا ہے اور یہی چیز انسانوں کے باہمی اختلافات کی بنیاد بن گئی ہے۔

قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں لیکن ان مذاہب کے پیرو سچائی سے منحرف ہو گئے، اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی یعنی خدائے واحد کی پرستش اور نیک عملی کے راستے کو پھر سے اختیار کرلیں تو قرآن کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اور گو اس راستے کے اختیار کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس راہ پر چلنے والوں نے گویا قرآن کو قبول کرلیا۔ تمام مذاہب کی مشترکہ سچائی کو قرآن نے "الدین" یا "الاسلام"

کا نام دیا ہے، وہ کہتا ہے، خدا کا دین اس لئے نہیں ہے کہ انسانوں کے درمیان
تفرقہ پیدا کی جائے بلکہ اس کے برعکس اس کا مقصد یہ تھا کہ تمام انسانوں کے
درمیان باہمدگر اخوت و رفاقت پیدا ہو اور سب ایک ہی پروردگار کے
رشتۂ عبودیت سے منسلک ہو کر اخوت کے ساتھ رہیں۔

مذہبی گروہ بندی کی لعنت آج بھی دنیا کے ہر گوشے پر مسلط ہے
لیکن اس لعنت سے نجات کس طرح حاصل کی جائے؟ یہ خرابی اس
لئے انسانوں میں سرایت کر گئی ہے کہ مذہب کی اصل روح کو نظروں سے
اوجھل رکھا گیا۔ اب یہ کام تمام مذہبی گروہوں کی پیروی کرنے والوں کا
ہے کہ وہ اپنے قدموں کے کھوئے ہوئے نشانوں کا پھر سے سراغ لگائیں
اور ہر مذہب کی بنیادی تعلیم یعنی دین کے راستے پر گامزن ہو جائیں۔
اگر یہ کام کر لیا گیا تو قرآن کہتا ہے تمام نزاعات ختم ہو جائیں گے۔ اور ہر
شخص یہ محسوس کرنے لگے گا کہ تمام مذاہب کا راستہ ایک ہی ہے یعنی
وہ ایک دین جو پوری بنی نوع انسان کے لئے ہے اور جسے قرآن نے
"الاسلام" کا نام دیا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے امن و سلامتی کا راستہ
یعنی خدا پرستی اور نیک عملی یہی وہ واحد راستہ ہے جس پر چل کر نوع
انسانی کی باہمی یگانگت کے ٹوٹے رشتوں کو جوڑا جا سکتا ہے یا اس تصور
کو پھر سے زندہ کیا جا سکتا ہے کہ سب انسانوں کا ایک ہی پروردگار ہے، ہم سب
کو ایک ہو کر اسی کی بندگی کرنی چاہیئے اور اسی کے آگے سر جھکانا چاہیئے تاکہ
ہمارے تمام آپسی نزاعات ختم ہو جائیں جو ہم نے اپنے ہاتھوں پیدا کر لئے

ہیں۔ قرآن کا یہی پیام تھا جو محمدؐ کے زمانے میں تمام مذاہب اور ادیان کے پیروؤں کو دیا گیا۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ

(۳ : ۵۷)

اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں طور پر (مسلم) ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا معبود نہ بنائیں۔

جمعیتِ انسانی کو متحد کرنے کے لئے قرآن ایک وفاقی اصول پیش کرتا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی قسم کی شرع و منہاج یا ایک ہی طرح کے ضابطہ وقانون یا ایک ہی قسم کے طریقِ عبادت کے ذریعہ تمام دنیا کے انسانوں کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر دیا جاتا۔ اس لئے قرآن صرف اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ انسانی معیشت کو ایک ایسی بنیاد پر کھڑا کرو کہ دنیا کی مختلف اقوام، خدائے واحد کی پرستش کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ اخوت و رفاقت کے رشتے میں منسلک رہ سکیں اور ایک خاندان کے افراد کی طرح نیک عملی کی راہ پر چل کر زندگی سے افادہ و فیضان حاصل کر سکیں۔ ایک حدیث میں بنی نوع انسان کی اسی برادری کو "ایک خدا کا کنبہ"

یا ایک ایسے گلے سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں ہر فرد کی حیثیت ایک دوسرے کے لئے گلہ بان کی ہوگی ، اور ہر ایک پورے گلہ کی بھلائی و نگہبانی کا ذمہ دار ہوگا۔

نزول قرآن کو تیرہ سو سال سے زیادہ ہو چکے، لیکن قرآن نے جو پیام اس وقت دیا تھا آج بھی وہ اپنی جگہ پر قائم اور اٹل ہے۔
